گرداب کی شناوری
زہرا داؤدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# گرداب کی شناوری

زہرا داؤدی

ناشر

جاودان

کتاب کا نام : گرداب کی شناوری

مصنفہ : زہرا داودی

کمپوزنگ : جاوداں لیزر کمپوزرس ۲۸۰۔ ایچ رضویہ سوسائٹی۔ کراچی

فون : ۶۲۵۴۶۲ ۔ ۶۲۳۲۵۶

ناشر : جاوداں پبلشرز

سرورق : باشام

طابع : اوکھائی پرنٹنگ پریس۔ کراچی

سنہ اشاعت : ۱۹۹۶ء

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : ۱۵۰ روپے

# انتساب

جبیب کے نام

اور ان سبھوں کے نام جنھیں انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے پیار ہے۔

زہرا داؤدی

# مستحضراتِ کتاب

# چھرہ نما

| | |
|---|---|
| نام | زہرا داؤدی |
| والد کا نام | مولانا علی اصغر |
| جائے پیدائش | چھپرہ ، بہار ، ہندوستان |
| والدہ کا نام | فاطمہ خاتون |
| خسر | مولانا شفیع داؤدی |
| شوہر | حبیب داؤدی |
| اولادیں | ماشا۔ اللہ چار اولاد ہیں : تنویر داؤدی ، جاوید داؤدی ، ناہید داؤدی اور ندیم داؤدی |
| تعلیم | معاشیات اور علم سیاست میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور مظفر پور بہار یونیورسٹی سے ۱۹۶۲ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی ۔ |
| پیشہ | ۱۹۶۳ء میں مغربی بنگال کی بار کونسل میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کلکتہ میں رجسٹر ہوئیں ۔ ۱۹۶۵ء میں پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ ۔ ایس ۔ کالج میں بطور لکچرر تقرر ہوا ۔ |

۱۹۷۹ء میں بائیں بازو کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی بنا پر نوکری سے برخاست کی گئیں۔ ۱۹۸۰ء میں سندھ بار کونسل کی رکنیت بحیثیت ایڈوکیٹ حاصل کی۔ نوکری کے دوران ڈیموکریٹک ویمن ایسوسی ایشن سندھ کی نائب صدر اور معتمد رہیں۔

موجودہ مشاغل : ڈیموکریٹک ویمن ایسوسی ایشن سندھ کی صدر ہیں۔ اس کے علاوہ خواتین کی خصوصی مسائل پر انہیں بلا معاوضہ مشورہ ( CONSULTATION ) مہیا کرتی ہیں۔

آئندہ کا پروگرام : حضرت علامہ اقبال کا یہ مصرع

خاموش نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں اپنا

( ناشر )

# حرفِ حق

گفتار صدق مایہ ٔ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود

محترمہ زہرا داؤدی کا شمار بھی ایسی شخصیتوں میں ہوتا ہے جو سچ بولنے کے عواقب و نتائج سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اپنے آپ کو صدق گفتاری سے باز نہیں رکھ سکتیں اور اس کی پاداش میں ہر روز ایک تازہ بلا میں گرفتار اور ایک نئی مصیبت سے دچار رہتی ہیں۔

پا بہر جا میگذاری نشتری در خاک ہست
شیشہائے آسماں گویا کہ برہم خوردہ است

"گرداب کی شناوری" ایک ایسی دلیر اور باغی خاتون کی داستان حیات ہے جس کو قدرت نے بیدار مغزی اور روشن فکری کی دولت سے مالا مال کر کے ذہنی فلاکت کے اوہام زدہ معاشرہ میں خلق فرما دیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح فکر و نظر کے تضادات کی آویزش نے جو گل کھلائے ہوں گے ان کا بیان کسی سحر انگریز داستان سے کم دلچسپ ہرگز نہ ہوگا۔

زہرا داؤدی نے اپنی زندگی کے تحیر خیز و ولولہ انگیز واقعات کو اس شعر کے علی الرغم

از منے بے عاقبت آغاز ہستی را مپرس
کز گراں خوابی سر افسانہ را گم کردہ ام

نہایت ترتیب و تسلسل اور تمکین و تحمل سے لکھا ہے اور اس حقیقت کے باوجود کہ ان کا کاروان عمر کب کا منزل شیب کی طرف مڑ چکا ہے، جہاں ماضی کی یادیں حافظہ کی گرفت سے نکلنے لگتی ہیں اور جوانی کے افکار و عقائد کا دم پھولنے لگتا ہے، اپنی سرگذشت حیات نہایت اعتماد اور بلا کے جذبہ ایقان سے سرشار ہو کر تحریر کی ہے اور نتیجتاً

معانیش در زیر حرف سیاہ
درخشندہ چوں مہر روشن چو ماہ

کا معاملہ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ "گرداب کی شناوری" خود نوشتوں میں اپنے سادہ، دل آویز اور راست اندازِ بیان کی وجہ سے مقبولیت کے بلند درجہ پر فائز ہو گی۔ انشا اللہ

حسین انجم

(مدیر طلوعِ افکار)

# دورِ طفلی کی سیاحت

عصمت چغتائی کو اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ پہلی بار آگرہ کی گلیوں میں ہوا جب لڑکوں کی طرح اچھل کود کرنے اور کلانچیں بھرنے پر پاس پڑوس اور عزیز و اقارب کے عتاب اور نکتہ چینیوں کا نشانہ ان کو اپنی اماں کی وساطت سے بننا پڑا۔ مجھے اپنے لڑکی یا بہار کی خواتین کی اصطلاح میں بیٹی ذات ہونے کا شعور اور صدمہ چھ سال کی عمر میں پہلی بار بگھی گاڑی پر بیٹھنے کے موقع پر ہوا۔ پٹنہ سے نگر نہسہ اپنے ننھیال جاتے ہوئے مجھے بند بگھی گاڑی پر اماں کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ بھیا اوپر کوچوان کے ساتھ ٹھاٹ سے بیٹھے اور تو اور کوچوان کے ہاتھ سے چابک لے کر مجھے جلانے کے لئے بار بار اسے ہراتے بھی تھے۔ میں نے بھیا کے ساتھ بیٹھنے کی ضد کی تو اماں کی ڈانٹ پڑی کہ کہیں بیٹی ذات بھی لڑکوں کی طرح کوچوان کے ساتھ بیٹھتے اچھی لگتی ہے۔ تبھی میں نے دل سے دعا کی کہ اللہ مجھے لڑکی سے لڑکا بنا دے کہ بگھی کی چھت پر کوچوان کے برابر بیٹھ کر چابک ہرا سکوں۔ لیکن پھر فوراً ہی اپنی مانگی ہوئی دعا کی قبولیت کے امکان سے دل دہل اٹھا کہ اگر جو سچ مچ میں اللہ نے لڑکا بنا دیا تو پھر بھیا کی طرح پڑھنا پڑے گا اور آموختہ یاد نہ ہونے کی صورت میں یا جی لگا کر نہ پڑھنے

پر پٹائی ہو گی، کیونکہ اس چھوٹی سی عمر میں بھی اتنی بات تو پتا تھی ہی کہ میں چونکہ لڑکی ہوں، اس لئے زیادہ پڑھائی لکھائی ضروری نہیں ہے کہ بڑی ہوئی، شادی ہوئی اور وارے نیارے ہوئے اچھی تقدیر اور اچھے خدائے مجازی کے طفیل ۔ اذان کی آواز کے ساتھ ہی یہ سبق بھی پیدائش کے ساتھ ہی لڑکی کو پڑھایا جاتا تھا

" بیٹی ذات کو نوکری تھوڑی کرانا ہے جو صبح و شام اسے پڑھانے کے لئے لے کر بیٹھ جاتی ہو؟ " میری پھوپھیاں اماں کو شرم دلایا کرتیں ۔ سو پڑھنے سے جان تو نہ بچتی تھی کہ اماں کو بھی دھن تھی کہ بیٹی پڑھ لکھ کر عالم فاضل بن جائے، لیکن بھیا کی طرح پٹائی بھی نہ ہوتی تھی، چنانچہ میں نے پھر دل ہی دل میں نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ پہلی دعا میں یہ ترمیم کی کہ اللہ بگھی گاڑی میں بیٹھنے کے وقت مجھے لڑکا بنا دے تاکہ بھیا کی ہمسری اور کوچوان کی قربت حاصل ہو سکے اور پڑھنے کے وقت لڑکی کہ پٹائی سے بچ سکوں ۔ پتا نہیں فرشتوں نے کس عالم بیزاری میں میری دونوں دعاؤں کو نوٹ کیا کہ اللہ میاں کے یہاں یہ کچھ الٹی سیدھی ہو کر پہنچیں ۔ قبولیت تو حاصل ہوئی، مگر یوں کہ لڑکی ہونے کا خمیازہ تو عام لڑکیوں اور پھر عورتوں کی طرح بھگتنا ہی پڑا، لیکن لڑکوں کی طرح پاپڑ بیل کر پڑھائی اور پھر مردوں کی طرح کمائی بھی کرنی پڑی ۔ اشرف بھیا، جو آگے چل کر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے صف اول کے رہنماؤں میں شمار ہوئے، مجھ پر بڑا رعب جھاڑا کرتے تھے ۔ ایک تو بیٹا ذات دوسرے عمر میں مجھ سے بڑے، چنانچہ اماں کی نظروں میں انہیں مجھ پر دوہری فوقیت حاصل تھی ۔ پڑھاتے تو مجھے خاک نہ تھے، لیکن پڑھانے کے نام پر اپنی علمیت کا رعب ضرور ڈالتے تھے ۔ ایک بار مجھے زیر کرنے کے لئے یکایک میرا امتحان لیا۔

" اچھا! بتاؤ بھیڑ اور بھیڑیا میں کیا فرق ہے " ڈر کے مارے جان نکل گئی کہ

اب غلط جواب دینے پر اماں سے ضرور شکایت ہو گی کہ جی لگا کر پڑھتی نہیں ہے ۔ اپنی دانست میں مذاق میں بات ٹالنے کی خاطر ہم نے کہا،

" بھیڑیا کھاتا ہے، بھیڑ کھاتے ہیں ۔" خلافِ معمول اور خلافِ توقع بھیا بہت خوش ہوئے اور خوب ہی خوب شاباش دی ۔ شاید بھیا کو اپنے اسکول کے اساتذہ پر رعب جمانے کے لئے اچھا سا جملہ ہاتھ لگ گیا تھا ۔

شامت اعمال دیکھئے کہ یہی تیکھے کٹیلے بھیا میرے سیاسی اتالیق بھی بنے ۔ مارکس کا کمیونسٹ مینیفسٹو میں نے پہلی بار انہیں کی کتابوں میں سے چرا کر پڑھا اور جب اس کا ہر ہر لفظ دل اور ذہن میں گھر کرنے لگا تو میں نے واقعی بھیا کی فوقیت تہ دل سے قبول کر لی ، اگرچہ اس فوقیت کی بنیاد نہ ان کا بیٹا ذات ہونا تھا نہ عمر میں مجھ سے بڑا کہ " بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال " اور مزید شامت اعمال کہ تب سے لے کر آج تک میں ان کی (اپنے بھیا کی) عظمت و بزرگی اور قابلیت کی قائل چلی آرہی ہوں ۔

# خود نوشت

زندگی میں کیا کھویا کیا پایا ، جی چاہتا ہے اپنے آپ سے نہیں بلکہ اللہ میاں سے اس کا شکوہ کروں کہ بھلا ایسی باغی روح کو پیدا کرنے کی اسے کیا سوجھی تھی ماضی کی وسعتوں میں کھو کر جب اپنے ذہن کو کریدتی ہوں تو قدم قدم پر طوفانی لہروں کا عکس ملتا ہے ۔ ساحل سے بہت کم واسطہ پڑا ۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچپن بڑا سنہرا اور سہانا ہوتا ہے ۔ پتا نہیں ہوتا ہوگا ۔ میرا تو بچپن بھی کٹھن ہی تھا ۔ حافظہ کی لوح پر جو کچھ بھی محفوظ ہے ، اسے تاب ناکی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔

ابتدائی بچپن حیدرآباد دکن میں گذرا ۔ گھر میں پانچ بڑے اور ایک چھوٹے

بھائی تھے اور میں اکلوتی بہن - بڑے بھیا (جو عمر میں مجھ سے ستائیس سال بڑے تھے) لڑکیوں کو اسکول میں پڑھانے کے سخت خلاف تھے - ابا بھلا بڑے بیٹے کی بات کیسے ٹالتے - بڑے بھیا کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ خاندان میں کسی لڑکی نے اسکول میں نہیں پڑھا ہے، اس لئے وہ خاندانی روایت سے بغاوت کیوں کریں - پھر ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اسکول میں پڑھ کر لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں - ویسے یہ اس زمانہ کی بات ہے جب میری عمر چھ، سات سال کی تھی اور آوارہ ہونے کے لئے ابھی زمانہ درکار تھا، چنانچہ میرا داخلہ اسکول میں کرانے کے بجائے ۲ گز کا دوپٹا اڑھا کر پردہ میں بٹھا دیا گیا اور پردہ بھی ایسا کہ گھر کے بیرونی دروازہ تک جانا ممنوع تھا - میرے رونے دھونے، التجاؤں اور منتوں نے بھی بڑے بھیا اور ابا کا دل نہ پگھلایا اور مجھے اسکول میں نہ داخل کرایا گیا - ضدی اور ہٹیلی طبیعت کی لڑکی جس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو کھیل یا جو آزادی بھیا یا چھوٹے بھائی امجد کے لئے جائز ہے، وہ کیوں ان سے محروم ہے ایسا نہیں ہے کہ مجھے ماں باپ یا بھائیوں کی محبت نہ ملی - محبت اور پیار بہت ملا - چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی - گو بڑیہاں ہوئی کہ قسمت نے مجھے تین نسل پہلے بہار کے شہر چھپرہ میں نیست سے ہست میں لا پھینکا - گھر پر کوئی بڑے بھائی انگریزی اور حساب پڑھانے کو تیار نہ ہوتے تھے - اماں بے چاری اسکول بھیجنا چاہتی تھیں، لیکن ابا اور بھیا کے آگے ان کی چلتی کب تھی - وہ ابا سے تیس سال چھوٹی اور اپنے بڑے بیٹے سے تین سال چھوٹی تھیں - جلد ہی اردو پڑھنا آگیا تھا - قرآن شریف، فارسی اور عربی ابا پڑھاتے تھے - اصل میں میرے ابا لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف نہ تھے، لیکن بڑے بیٹے کے اثر میں آگئے تھے. مگر بھلا اس باغی وجود نے پابندیوں سے سمجھوتا کب سیکھا تھا - گھر میں بھائیوں کی بڑی قدر ہوتی تھی کہ قبر پر چراغ تو بیٹا ہی جلاتا ہے نا! مجھے تو پرائے گھر جانے کے لئے تیار کیا جانا تھا جو اسکول کی پڑھائی سے زیادہ اہم تھا

اور مجھ سے امید کی جاتی تھی کہ ڈپٹی نذیر احمد کی اصغری کی طرح آٹھ برس کی عمر میں اٹھائیس برس کی عمر کی عورت کے کرتب دکھاؤں ۔ باپ اور بڑے بھائیوں کے سامنے کھلے سر نہ جاؤں (حالانکہ چھوٹے سے بڑے سبھی بھائی، ابا کے سامنے کھلے سر ہی رہتے تھے)۔ کھانا پکانے میں اماں کی مدد کروں، دستر خوان لگا کر بھائیوں کو کھانا کھلاؤں، برتن اٹھاؤں اور سگھڑ بیٹی بن کر سبھوں کے پیار سمیٹوں۔

امجد، میرے چھوٹے بھائی کا نام اسکول میں لکھوایا گیا تو میرے پڑھنے کی راہیں کھل گئیں ۔ کئی سال تک یہ سلسلہ رہا کہ امجد اسکول سے آکر وہی سبق مجھے پڑھا دیتے تھے ۔ بچہ بے چارا ایک بار جیومیٹری میں خط مستقیم کی تعریف سے مجھے قائل نہ کر سکا تو ہم دونوں کی لڑائی ہو گئی ۔ میرا چھوٹا سا بھائی ہزار سمجھاتا رہا کہ خط مستقیم میں صرف طول ہوتا ہے عرض نہیں، پر کاہے کو میری سمجھ میں بات آئے ۔ آخر میں نے فیصلہ صادر کر دیا کہ امجد کو کچھ نہیں آتا اور میں غلط چیزیں نہیں پڑھوں گی ۔ امجد کب چوکنے والا تھا ۔ ڈٹ گیا کہ مجھے اس سے پڑھنا تو پڑے گا کہ پڑھانے کی فرمائش کیوں کی تھی ۔ ویسے بھی ہار تو مجھے ماننی ہی تھی ۔

پھر ابا پٹنہ آگئے ۔ بڑے بھیا حیدر آباد میں رہ گئے تو میرے شوق کو دیکھتے ہوئے اور سب سے بڑھ کر میں نے جو بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر میرے منجھلے بھائی علی اسلم نے ابا کو تیار کر لیا کہ میرا نام اسکول میں لکھوا دیا جائے ۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے ۔ یہ میری زندگی کی دوسری بغاوت تھی جو کامیاب ہوئی ۔ یادداشت میں محفوظ سب سے پہلی بغاوت اپنی زندگی میں، جو مجھے یاد ہے، وہ ہے بان کے کھرے پلنگ پر کسی ضد کے پورا نہ ہونے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رونا ۔ اس وقت میری عمر چار سال تھی اور زندگی کی اگلی منزلوں کے لئے چار سال کی بچی کی یہ ضد اس کی قوت ارادی کا روپ دھار کر میری سرشت اور شخصیت کا اہم اور قیمتی ستون ثابت

ہوئی۔

دوسرے بھائی تو عمر میں مجھ سے خاصے بڑے تھے، اس لئے کسی غلطی پر ان سے جھڑکیاں تو ملتی تھیں، لیکن لڑائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اشرف بھیا مجھ سے کم بڑے تھے۔ وہ مجھ سے لڑتے بھی تھے اور رعب بھی جتاتے تھے، اپنی علمیت اور عمر دونوں کا۔ ہم تھے کہ انہیں خاطر ہی میں نہ لاتے تھے، اگرچہ گھر میں انہیں جو مراعات حاصل تھیں، ان سے جلتے ضرور تھے۔ ایک روز بھیا نے اردو پڑھاتے پڑھاتے مجھ سے "نرالا" کا مطلب پوچھا۔ میں نے جھٹ سے کہا "خراب"۔ وہ ماننے کو تیار ہی نہیں نہ میں ہتھیار ڈالنے پر آمادہ۔ اصل میں جب کود پھاند کرنے یا دوپٹا سر پر نہ لینے یا بھاگتے ہوئے دروازہ سے باہر لڑکوں کی طرح نکل جانے پر اماں سے تنبیہ اور ڈانٹ پھٹکار ملتی تھی تو وہ یہی کہتی تھیں،

"اللہ! اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس لڑکی کی تو ہر ادا نرالی ہے۔" سو منطقی طور پر میں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ نرالا کا مطلب خراب ہوتا ہے۔ چنانچہ بھیا کو نیچا دکھانے کے لئے میں دوڑی اماں کے پاس۔

"اماں، نرالا کا مطلب خراب ہوتا ہے نا"

جیسے تمہاری ہر ادا نرالی ہے۔" اماں مجھے ننگے سر دوڑتے دیکھ کر کچھ زیادہ ہی میرے مستقبل سے مایوس ہو گئی تھیں اور میں نے پھر بھی بھیا کی بات مان کر نہ دی کہ نرالا کا مطلب کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

وقت گذرتا رہا۔ اسلم بھیا نے پٹنہ میں میرا نام گرلز ہائی اسکول میں لکھوا دیا تھا سو تعلیم بھی جاری رہی۔ گھر کے مالی وسائل اچھے نہ تھے۔ اسکول سرکاری تھا اور ہونہار، نادار طالبات کو سرکاری وظائف پر پڑھنے کی سہولت تھی۔ میرے اسکول کی استانیاں، جو زیادہ تر غیر مسلم بنگالی تھیں، مجھے بہت مانتی تھیں اور میرے حالات

سے واقف ۔ چنانچہ مجھے بھی وظیفہ ملا اور ہر مہینے فیس نہ دینے کی وجہ سے نام کٹ جانے کے خوف اور امکان سے بھی نجات ملی ۔

لیکن جلد ہی اپنی ہی کرنی سے یا اماں کی اصطلاح میں اپنے " نرالا پن " نے ایک نئی شامت سے دو چار کیا ۔ دوسری جنگ عظیم (اس کی تفصیل آگے آئے گی) شروع ہو چکی تھی ۔ میرے دو بھائی کیمونسٹ پارٹی میں کافی سرگرم تھے ۔ اشرف بھیا اپنی سرگرمیوں کی بنا پر دیولی جیل میں تھے اور ان کی بھوک ہڑتال کی خبریں آ رہی تھیں ۔

دوسری جنگ عظیم چھڑی تو ہم اسکول میں پڑھتے تھے ۔ لیکن کیمونسٹ مینیفیسٹو اور اسی طرح کے کچھ اور کلاسیکل مارکسسٹ لٹریچر پڑھنے کے علاوہ روزانہ اخبار بھی پڑھتے تھے ۔ ہٹلر کو بھلا ہم لوگ نازی ڈکٹیٹر کیسے مان لیتے کہ سوویت یونین سے اس کا جنگی معاہدہ جو تھا ۔ سو ہمارے نوجوان ، باغی اور انقلابی اذہان نے بلا کسی پس و پیش کے یہ تسلیم کر لیا اور اس کے پرچار میں لگ گئے کہ یہ جنگ سامراجی مفادات ، لوٹ کھسوٹ اور دنیا کے مزدور طبقہ کا استحصال کرنے کے لئے لڑی جا رہی ہے اور اتحادی طاقتوں کے ساتھ تعاون کرنا ، مزدور طبقہ کے ساتھ غداری ہے ۔ (اگرچہ میرا انقلابی میدان تب تک صرف اسکول کے احاطہ اور لڑکیوں تک ہی محدود تھا) ۔ کتنا حسین اور سکون پرور تھا وہ زمانہ ۔ کسی بات کی فکر نہیں ، کسی محرومی کا غم نہیں ، کسی بے انصافی کا شکوہ نہیں ۔ جب بڑے سے بڑے مسائل چٹکی بجاتے ہیں حل ہو جاتے تھے بلکہ بغیر کسی سوچ ، فکر اور کاوش کے حل ، بوتل کے جن کی طرح ، آموجود ہوتا تھا ۔ اپنا کام اور فرض تو بس ذرا سا ہی تھا کہ مارکس اینجلز لینن اور اسٹالن کی تعلیمات اور ان کی برتی اور دی ہوئی لائن پر کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مہر اور وساطت سے اعتماد کامل رکھ کر جان کی بازی لگانے سے بھی کبھی

گریز نہ کریں اور جان کا کیا ہے ۔ یہ تو آنی جانی ہے ۔ سو اس حقیر سی شے کے عوض گویا صرف اپنی ہی نہیں بلکہ تقدیر عالم بھی مٹھی میں آتی محسوس ہوتی ۔ سوچنے اور غور کرنے کی مصیبت سے الگ نجات کہ پارٹی میں فیصلہ ڈیموکریٹک سینٹرلزم ، یعنی جمہوری مرکزیت کے ذریعہ ہوتا ہے اور پارٹی مزدوروں کی پارٹی ہے جو انقلاب کا ہراول دستہ ہے ۔ سو اس کا فیصلہ غلط ہو ہی نہیں سکتا ۔ ہمارا کام اسکول کے اس دور میں صرف چند اصطلاحیں ، مثلاً استحصال ، سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام ، مزدور طبقہ ، پرولتاری آمریت ، ریاست استحصالی طبقہ کے ہاتھوں میں مزدور پر تشدد کا ذریعہ ، شادی کا مطلب عورتوں کا صنفی استحصال وغیرہ وغیرہ کو ہمیشہ یاد رکھنا اور موقع بے موقع ان اصطلاحات کا استعمال کرنا تھا ۔

چنانچہ اب تک بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اور کمیونسٹ مینیفیسٹو پڑھ پڑھ کر سائنٹفک مارکسزم کی آفاقیت اور اسٹالن کے ہاتھوں اس کی آنے والی عالم گیر فتح پر پکا ایمان لا چکے تھے ، اگرچہ جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہمارا اعتقاد بس عقیدہ اور گھر کی چار دیواری یا اسکول کی مسلمان لڑکیوں کے درمیان اپنے آپ کو دہریہ کہلوائے جانے تک ہی محدود تھا ۔ ہم جن دنوں کی بات کر رہے ہیں ، اس وقت تک روس نے ہٹلر کے خلاف دوسری جنگ عظیم میں شرکت نہ کی تھی اور اسے سامراجی مفاد کے لئے لڑی جانے والی جنگ قرار دیا تھا ۔

اسکول میں ، میں پڑھتی تھی ، سرکاری تھا ۔ جنگ میں اخلاقی اور مالی امداد کے لئے لڑکیوں سے ایک ورائٹی شو کرانے کا فیصلہ انتظامیہ نے کیا ۔ اس ورائٹی شو میں مجھے ایک اہم کردار ادا کرنا تھا ۔ میں نے کچھ لڑکیوں کے ساتھ مل کر پورے پروگرام کو سبوتاژ کرنے کی اسکیم بنائی ۔ نتائج کیا بھگتنے پڑیں گے ، اس کی فکر کس ناعاقبت اندیش کو ہونی تھی ۔ ہماری پلاننگ یہ تھی کہ فائنل ریہرسل کے روز ہم سبھی ورائٹی

شو میں حصہ لینے سے انکار کر دیں گے اور چھوٹے کلاس کی لڑکیوں کو بھی بھا بجھا کر اپنے ساتھ ملا لیں گے، چنانچہ فائنل ریہرسل کے روز چند ایک کو چھوڑ کر زیادہ تر لڑکیوں نے ہم لوگوں کا رٹایا ہوا سبق دہرانا شروع کیا کہ یہ سامراجی جنگ ہے اور اس لئے وہ پروگرام میں حصہ نہیں لیں گی۔ انتظامیہ کے درمیان سراسیمگی پھیل گئی کہ دوسرے ہی روز اعلیٰ سرکاری افسران ورائٹی شو میں مدعو تھے۔ پوچھ تاچھ پر جونیئر کلاس کی کچھ لڑکیوں نے اگل دیا کہ میری لیڈر شپ میں کچھ اور سینئر کلاس کی لڑکیوں نے انہیں اس بغاوت پر اکسایا تھا۔ فوراً پرنسپل کے آفس میں میری طلبی ہوئی۔ میں نے تو اپنا جرم فوراً تسلیم کر لیا۔ اول تو بغاوت کے جرم کا ملزم ہونے سے انقلابی اور مارکسسٹ ہونے کی شان بڑھتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس وقت تک ماں کی گود میں "ہمیشہ سچ بولو" کا جو سبق پڑھا تھا، اس کی اخلاقی بنیادیں موقع پرستی کے تیشہ سے مسمار نہیں ہوئی تھیں۔ پرنسپل نے دوسری لڑکیوں کے نام پوچھے جو اس حرکت میں میری معاون تھیں۔ میں نے ان کا نام بتانے سے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ سازش کے بے نقاب ہو جانے سے بے حد خوف زدہ تھیں اور مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ میں پرنسپل کو ان کا نام نہ بتاؤں گی۔ پرنسپل نے مجھے کافی ڈرایا دھمکایا کہ اگر میں نے اپنی اس غلط حرکت کے لئے معافی نہ مانگی تو نہ صرف یہ کہ میرا اسکالر شپ بند کر دیا جائے گا بلکہ مزید تادیبی کارروائی کے طور پر مجھے اسکول سے بھی نکال دیا جائے گا۔ انقلابی اصولوں کو اپنانے سے انسان نتائج سے لاپروا ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسکالر شپ بند ہو گیا تو آگے تعلیم جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا، میں نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ یہ میرے اصولوں کی بات ہے۔ بات یہاں ختم ہوئی کہ پرنسپل نے مجھے اپنے فیصلہ پر مزید سوچنے کے لئے کچھ مہلت دی۔

اسی درمیان مسز وجے لکشمی پنڈت پٹنہ آئیں۔ طالبات کے زبردست اجتماع

کو انہوں نے خطاب کیا اور جرمنی کے خلاف جنگ جیتنے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی انہوں نے مستقبل کے معماروں کو سچائی، اصول پرستی اور جذبہ قربانی کا بھی سبق پڑھایا۔ میں ان دنوں اسی پریشانی اور کشمکش میں تھی کہ جھوٹی معافی مانگ کر اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھوں یا پرنسپل کو بتا دوں کہ مارکسسٹ انقلابی کے اصول ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ وجے لکشمی کی شخصیت اور ان کی باتیں مجھے بڑی مسحور کن لگیں۔ میں نے ان سے تنہائی میں ملنے کی درخواست ایک پرچی بھیج کر کی۔ جو انہوں نے بڑی شفقت سے قبول کی۔ وجے لکشمی کو اپنی ساری رام کہانی سنا کر ان سے دوٹوک الفاظ میں مشورہ مانگا کہ آیا میں اپنے اصولوں کے خلاف جا کر پرنسپل سے معافی مانگ لوں یا مزید تعلیم کو خیرباد کہوں۔ مسز وجے لکشمی تھوڑی دیر پہلے اصول پرستی اور صداقت کا درس دے چکی تھیں، چنانچہ بےچاری نے مجھے گول مول سا جواب دیا جو مجھے کچھ جچا نہیں۔ ویسے وقت گذرتا گیا۔ نہ پرنسپل نے پھر مجھے معافی مانگنے کے لئے کہا اور نہ میری شکایت اوپر لکھ کر بھیجی یوں میں اسکول سے نکالی بھی نہ گئی اور اسکالر شپ بھی حسب دستور ملتا رہا۔ اسکول کی پرنسپل مسز رضا تھیں۔

ہمیں آٹھ سال کی عمر سے پردہ میں بٹھا دیا گیا تھا۔ برقع تو نہیں اڑھایا گیا تھا کہ گھر سے باہر یا یوں کہئے کہ تنہا بیٹی ذات کو دروازہ سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ کہیں گئے تو اماں کے ساتھ اسی پردہ والی بگھی گاڑی میں جس کے کوچوان کے بازو میں بیٹھنے کا کبھی بڑا ارمان تھا۔ جو دل ہی دل میں دم توڑ گیا اور ستم بالائے ستم

یہ کہ جب اسکول میں داخلہ دلایا گیا تو بھی اسکول جانے اور آنے کے لئے وہی پردہ والی بگھی گاڑی نصیب میں آئی۔ اس بگھی گاڑی میں ہمارے علاوہ پانچ، چھے مسلمان پردہ نشین لڑکیاں اور ایک نوجوان خوب صورت استانی ہوا کرتی تھیں جنہیں ہم لوگ "ٹیچرجی" کہا کرتے تھے۔ ان ٹیچرجی کی موجودگی کی وجہ سے اب پردہ والی بگھی

کا سفر بہت خوشگوار لگتا تھا۔ ان کی آواز بڑی مترنم تھی۔ جب وہ ایک غزل

چلے تھے بڑے دشمن جان بن کر
اب آ کر بسے دل میں ایمان بن کر

اپنی شیریں آواز میں گاتیں اور اکثر گاتیں تو سبھی لڑکیاں اور سب سے زیادہ ہم مسحور ہو جاتے تھے اور اپنی آواز کو بھی اسی ترنم اور سر میں ڈھال لینے کی تمنا ہونے لگتی۔

ایک روز محض آزمانے کے لئے کہ ہم بھی مذکورہ غزل گا سکتے ہیں یا نہیں، شام کے وقت گھر کی اوپر کی منزل پر منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر نہایت خشوع و خضوع کے عالم میں انہیں دو اشعار کو گانے کی ریاضت شروع کر دی۔ ابھی ٹھیک سے فیصلہ بھی نہ کر پائے تھے کہ ٹیچر جی کی مانند گلے سے شیریں آواز نکل رہی ہے یا محلہ کا دھوبی آواز کی سمت دوڑا چلا آرہا ہے کہ پیٹھ پر سرزنش کی ایک دھپ پڑی۔ اماں پیچھے کھڑی تھیں۔

"بولو بیٹیا! کون دل میں آبسا ہے؟" وہ اور کچھ نہ بولیں۔ سوچا ہوگا لوگ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ سیانی بیٹی اسکول جائے گی تو یہی سب ہونا ہے، لیکن ان کے چہرہ پر اپنی وجہ سے مایوسی کے لہراتے سایہ نے ہم میں پھر کبھی گانا گانے کی ہمت پیدا نہ کی۔ اب اتنی سمجھ بوجھ تو آ ہی گئی تھی کہ اماں کے دکھ اور ان کی غیر معمولی عظمت کو سمجھ سکیں۔

اماں اپنے سے تیس سال بڑے شوہر سے بیاہ کر آئیں تو گھر میں سب سے بڑا بیٹا انہیں اپنی عمر سے تین سال بڑا ملا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بوڑھے شوہر نوجوان بیویوں کے بہت چاؤ چونچلے کرتے ہیں، لیکن اماں کے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوا کہ انہیں میرے کئی بھائیوں کے چاؤ چونچلے جو کرنے تھے، لیکن اماں کی زبان پر نہ تو کبھی شکوہ کا ایک لفظ آیا نہ انہوں نے کبھی اپنی کم نصیبی کا رونا رویا۔ ابا، جو چھرہ

کے بڑے رئیس، عالم و فاضل، معزز شخصیت اور سیاسی طور پر کانگریس سے وابستہ تھے، چند مجبوریوں کی بنا پر گھر چھوڑ کر حیدرآباد اور پھر پٹنہ آبسے۔ اماں نے کبھی اپنی قسمت سے گلہ نہ کیا۔ پھر اشرف بھیا نے کم عمری سے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور طلبا تحریک میں جیل چلے گئے تو دوسری صبح اماں ابا کو اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا۔ اماں کو بڑا فخر تھا کہ ان کا بیٹا انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے جیل گیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے شام کو کچھ عورتیں اماں کے پاس اس امید میں دلاسا دلانے آئیں کہ بےچاری بیٹے کا حشر دیکھ کر رو دھو رہی ہوں گی۔ یہاں اماں نے بڑے ترنگ میں لیڈر جنگ آزادی کے مجاہد بیٹے کے کارنامے بیان کرنا شروع کر دیئے تو ساری بیویوں کے چہرے مایوسی کے مارے اتر گئے۔

"لو! ایک تو بیٹا کمیونسٹ ہو گیا اور جیل کاٹ رہا ہے اور ماں پر کوئی اثر ہی نہیں۔"

حبیب کا خاندان سماجی طور پر بہت ترقی پسند تھا اور عورتیں روایتی پردہ کی قیود سے آزاد تھیں۔ میرے سسر بھی پہلے تو کانگریسی سیاست میں پیش پیش تھے، پھر جماعت اسلامی سے متعلق ہو گئے تھے۔ ویسے میں نے کبھی انہیں بنیاد پرست اور متعصب مسلمان نہیں پایا۔ بلا کے روادار تھے ہمارا خاندان سرخ خاندان کہلاتا تھا اور انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ اس خاندان کے لڑکے تو لڑکے، اکلوتی بیٹی بھی سرخ پرچم کو مع ہنسولے ہتھوڑے، سلام کرتی ہے۔ پھر بھی حبیب کے لئے انہوں نے میرا انتخاب کیا کہ میں پہلی بہاری مسلمان لڑکی تھی جس نے امتیازی حیثیت سے میٹرک پاس کیا تھا اور میرے سسر اور حبیب دونوں ہی تعلیم یافتہ (جی ہاں! ان دنوں میٹرک پاس ہونا اور وہ بھی امتیازی حیثیت سے، تعلیم یافتہ کہلائے جانے کے لئے کافی تھا) بہو اور بیوی کے خواہاں تھے۔ میں نے انٹر سے لے کر اکنامکس اور علم

سیاسیات میں ایم ۔ اے ۔ اور قانون میں گریجویشن ، سبھی شادی کے بعد کیا ۔ مجھے حبیب اور ان کے والدین سے ہمیشہ تعاون اور ہمت افزائی ملی ۔ حبیب کے سیاسی خیالات میں سرخی کا اثر شادی کے بعد آیا اور بہت تیزی سے آیا ۔ ابتدا میں تو مجھے کچھ پتا ہی نہ چل سکا کہ کب اور کیسے وہ کیمونسٹ پارٹی کے زیر اثر آئے ۔ ان دنوں کیمونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی ۔ ہم کالج کی بائیں بازو کی طالبات ، یونین کے جھنڈے تلے زیر زمین اپنی مہم چلاتے تھے ، کیونکہ حبیب نے میرے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی ۔ ویسے اپنی دانست میں ، میں نے انہیں اپنے غیر قانونی مشاغل کی بھنک بھی نہ لگنے دی تھی ۔ انہیں دنوں سنیل مکرجی کیمونسٹ پارٹی بہار کے جنرل سکریٹری نے پارٹی فیصلہ کے مطابق ہمارے سیل کی کئی لڑکیوں کو (جن کی پارٹی کے ساتھ وابستگی کسی شک و شبہ سے بالاتر تھی) بشمول میرے ، باقاعدہ پارٹی کی رکنیت خفیہ طور پر دی ۔ تب کیمونسٹ پارٹی کا کارڈ ہولڈر ہونا بڑے اعزاز ، فخر اور ذمہ داری کی بات سمجھی جاتی تھی ۔ ہم لوگوں نے پہلے پارٹی ہمدرد کا درجہ ، پھر امیدوار ممبر اور پھر مکمل رکنیت حاصل کی ۔ اب میں پارٹی کے ہر فیصلہ پر امنا و صدقنا کہنے اور اس پر عمل کرنے کی پابند تھی ۔ میں اپنے آپ کو چکی کے دو پاٹوں کے بیچ محسوس کرتی تھی ۔ ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں انہیں (حبیب کو) میری درپردہ سرگرمیوں کا پتا نہ چل جائے ۔ ویسے اس بارے میں میرے دل میں کوئی الجھن نہ تھی کہ اگر پارٹی سے وفاداری کی قیمت مجھے حبیب کی ناراضگی کی شکل میں ادا کرنی پڑی تو میں یقیناً یہ قیمت ادا کروں گی ۔ مارکسزم تو میرا ایمان تھا اور ہے ۔ کسی فرد واحد کے لئے ایمان تو قربان نہیں کیا جا سکتا ، خواہ اپنی ذات کیوں نہ قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ جائے ، لیکن میری خوش بختی سے یہ نوبت ہی نہ آئی کیونکہ پارٹی کے قانونی ہونے کے بعد پتا چلا کہ وہ مجھ سے پہلے نہ صرف پارٹی کی رکنیت حاصل کر چکے تھے بلکہ میرے بارے میں

بھی انہیں سب کچھ علم تھا۔

بیڑی ورکرز یونین کی اسٹرائک بہار شریف میں تھی۔ یہ غالباً ۴۹ ۔ یا ۵۰ ۔ تھا اور تاریخ ۲۴ دسمبر۔ دوسرے روز، یعنی ۲۵ دسمبر کو، میرے بیٹے تنویر کی سال گرہ تھی ہم نے اچھا خاصا انتظام سال گرہ کے لئے کر رکھا تھا۔ تھوڑے بہت مہمان بھی مدعو تھے۔ حبیب کو کسی سرکاری کام سے ایمرجنسی میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ بارہ بجے رات، جب سب لوگ سردیوں کی آدھی رات لحاف میں دبکے خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے، مجھے پارٹی کا خفیہ پیغام ملا کہ فوراً پیغام دہندہ کے ساتھ روانہ ہو جاؤں کہ صبح مجھے بہار شریف میں بیڑی ورکرز یونین کے جلوس کی قیادت کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کھلے بندوں پارٹی نے کوئی ذمہ داری دی تھی۔ حالات یکایک یہ شکل اختیار کریں گے، مجھے امید نہ تھی اور نہ ہم پارٹی کے حکم سے سرتابی کرنے کے لئے تیار تھے۔ ویسے دل کانپ اٹھا کہ کہیں حبیب سے ہاتھ دھونے کا وقت آ تو نہیں پہنچا۔ پارٹی، اس کی تنظیم، ڈسپلن اور اس کے ساتھ وفاداری کے جذبہ نے اتنا سوچنے کی مہلت بھی نہ دی کہ میں جو اب تک طالبات کی انڈر گراؤنڈ تحریک سے وابستہ تھی، یکایک بیڑی ورکرز یونین کی لیڈر کیسے بن گئی اصل میں پارٹی اکلوتی مسلمان مارکسسٹ لڑکی کو کھلے بندوں اپنی سیاست میں لانا چاہتی تھی۔ ایک پرزہ حبیب کے نام لکھ کر تکیہ کے نیچے دبا دیا کہ میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہی ہوں۔ دونوں بچوں، یعنی تنویر اور جاوید، کو سوتا چھوڑ کر اور ساتھ ہی صدر دروازہ بھی کھلا چھوڑ کر (ان دنوں پٹنہ میں دروازہ میں آٹو میٹک لاک رائج نہ تھا) میں اپنے رہبر کے ساتھ نکل پڑی۔

بہار شریف تقریباً دو بجے رات پہنچی۔ ایک سنسان مقام پر گھپ اندھیری رات میں لالٹین کی روشنی میں ایک کٹیا میں انڈر گراؤنڈ میٹنگ تھی۔ صوبہ بہار کے

بہت سے اضلاع کے کامریڈ موجود تھے اور اگلی صبح کے جلوس کی اسٹریٹجی زیر غور تھی۔
۱۲ بجے دن جلوس جیل کے پھاٹک پر یونین کے گرفتار شدہ لیڈران کی رہائی کا مطالبہ کرنے والا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو وہیں بھوس کے ڈھیر پر سارے کامریڈ چند گھنٹے کی نیند لینے کے لئے ڈھیر ہو گئے۔ میرا تعلق اپر مڈل کلاس سے تھا۔ ڈر یہ تھا کہ اگر میں نے وہاں سونے میں ذرا بھی آنا کانی دکھائی تو کامریڈ اشخاص مجھے برژوائی ذہنیت کا اعلان کر کے بلیک لسٹ کر دیں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے کامریڈ لیڈر میرے ذہنی پس و پیش کا بھانڈا پھوٹنے سے پہلے ہی مجھے لے کر اپنے گھر چلے گئے جہاں ان کی ماں اور بہن تھیں۔ ایک بان کی چارپائی پر میرے لئے بستر وغیرہ مع سفید چادر اور رضائی، تیار تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ کامریڈ بھی میری طرح بدنام زمانہ برژوائی کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسرے روز میں جلوس کی قیادت کرتے ہوئے بڑے اعتماد اور احساس طمانیت کے ساتھ آگے آگے تھی کہ اپنے ضمیر کی پکار پر لبیک کہنے میں مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہوئی۔ پولیس نے کئی ہوائی فائر کئے، کیونکہ ان دنوں پاکستان کی طرح ایکسٹرا جوڈیشل قتل کا چلن وہاں نہیں تھا۔ جلوس میں بھگدڑ تو نہیں لیکن کھلبلی ضرور مچ گئی، مگر قدم بھلا کاہے کو ڈگمگاتے۔ "اس سڑی گلی سرکار کو ایک دھکا اور جو دینا تھا" یہ نعرے کیا تھے للکار تھی، چنانچہ بہت سارے کامریڈ مع کامریڈ زہرا داؤدی، گرفتار ہوئے۔ بہار شریف چھوٹی سی جگہ اور چھوٹے سے جیل خانہ کی تواریخ میں پہلا موقع تھا جو ایک لڑکی، اور وہ بھی مسلمان سیاسی قیدی کی حیثیت سے نظر بند ہوئی۔ پارٹی کی ہدایت اور حکمت عملی یہ تھی کہ جیل میں جتنا زیادہ احتجاج ممکن ہو کیا جائے اور بس چلے تو بھوک ہڑتال کی جائے۔

پہلے روز ہمیں ایک انتہائی چھوٹے سے سیل میں رکھا گیا۔ ہم نے جب اس پر

احتجاج کیا تو عورتوں کے وارڈ میں جرائم پیشہ عورتوں کے ساتھ رکھا کہ دوسری کوئی جگہ ان کے پاس نہ تھی۔ دو روز کے بعد ہمیں پٹنہ لے آئے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ اپنے گھر کے سامنے سے ہم پولیس وین میں نعرے لگاتے ہوئے گذرے کہ "جیل کے تالے ٹوٹیں گے۔ راج بندی چھوٹیں گے" یعنی جیل کے تالے ٹوٹے نہیں بلکہ ہمیں اندر لے جانے کے لئے کھولے گئے اور راج بندی چھوٹے نہیں بلکہ مزید بہت سے۔ بشمول ہماری اپنی ذات۔ بند کئے گئے۔

دوسرے روز حبیب علی الصباح جب گھر واپس آئے تو تکیہ کے نیچے انہیں میرا پرزہ ملا۔ میں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ بہت ضروری کام سے کہیں باہر جا رہی ہوں اور یہ کہ میرے لئے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن صبح کے اخبارات نے مولانا شفیع داؤدی صاحب کی بہو اور حبیب داؤدی کی بیوی زہرا داؤدی کی گرفتاری کی خبر نمایاں طور پر شائع کی تو گھر والوں کو بھی میرے اہم مشن پر جانے کے بارے میں اطلاع ملی۔ میرے ابا اور اماں تو خیر اپنی اولادوں کی اس طرح کی حرکتوں اور افتاد طبع سے واقف تھے۔ سسر بھی میرے سیاسی آدمی تھے اور اپنی کانگریس کی سیاست کے دوران بارہا جیل جا چکے تھے۔ مگر گھر کی بہو کے لئے یہ پہلا موقع تھا اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ کسی کو پتا نہیں کہ میں بھاگ گئی کہ بھگائی گئی۔ گرفتاری کے دوسرے روز اخبارات کے ذریعہ حبیب اور گھر والوں پر حقیقت حال کا انکشاف ہوا ورنہ تو سال گرہ کی پارٹی میں آئی ہوئی خواتین نے طرح طرح کے سوالات سے اماں اور ساس دونوں کو بلاضرورت ہی سراسیمہ کر دیا تھا۔

حبیب۔ ذمہ دار سرکاری عہدہ پر فائز تھے۔ کمیونسٹ پارٹی سے ان کا خفیہ تعلق تھا۔ اپنی طرف سے مجھے بھی امید تھی کہ میری سرگرمیاں بھی خفیہ رہیں گی۔ بہرحال اب میرا معاملہ تو طشت از بام ہو ہی چکا تھا۔ میرے ذہن و گمان میں بھی نہ تھا کہ حبیب میری ضمانت لے کر مجھے چھڑانے کے لئے آئیں گے۔ ویسے بھی یہ اقدام

ان کی نوکری کے لیے برا شگون ثابت ہو سکتا تھا۔ قصہ مختصر بائکلہ پور جیل میں آنے کے کچھ ہفتوں بعد سپرنٹنڈنٹ نے مجھے آفس میں بلایا تو حبیب ایک بچہ کو گود میں لئے اور دوسرے کی انگلی پکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ دونوں بچے تنویر اور جاوید تھے نظریں ملیں۔ دونوں بچے لپک کر میری گود میں آگئے۔ جی چاہتا تھا انہیں کلیجے سے چمٹائے رکھوں اور کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں، لیکن ایک مارکسسٹ انقلابی ماں کو بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد حبیب پہلی بار بولے،

"تمہاری ضمانت لینے آیا ہوں۔"

"میری نقل و حرکت اور مشاغل پر آپ کوئی پابندی تو عائد نہیں کریں گے؟"

کچھ دنوں بعد ضمانت پر میری رہائی ہو گئی اور دوسرے ہی روز اپنے شوہر کامریڈ حبیب داؤدی کے تعاون اور وساطت سے میں انڈر گراونڈ چلی گئی کہ پارٹی کی پہلی ہدایت تھی کہ اب کسی حال میں مجھے گرفتار نہیں ہونا ہے۔ جانے حبیب نے اپنی نوکری کیسے بچائی۔ روپوشی کے درمیان چند بڑے دل چسپ لطیفے ہوئے جن کی چاشنی آج بھی پھیکے منہ کا مزہ بدل دیتی ہے۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ ہمارے زیر زمین رہنے کے انتظام کی ذمہ داری پارٹی نے حبیب ہی کو سونپی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ سیاسی حیثیت سے وہ بالکل معروف نہ تھے۔ اور خوش باش قسم کے انسان سمجھے جاتے تھے جس کا بد قسمتی سے ایک گم کردہ راہ بیوی نے جینا حرام کر رکھا تھا۔ حبیب جب میرے خفیہ ٹھکانوں پر مجھ سے ملنے آتے تو طرح طرح کے افسانے، جو بدخواہوں یا بہی خواہوں نے میرے بارے میں مشہور کر رکھے تھے، مجھے سناتے اور ہم مل کر خوب ہنسا کرتے۔ میرے کردار پر کیچڑ اچھالنا تو خیر بڑی فطری سی بات بدفطرت لوگوں کیلئے تھی۔ ایسے لوگ بڑے پریشان تھے کہ حبیب ایسے نیک بھولے بھالے شخص کو کیسے یہ عقل سکھائی جائے کہ ان کی بیوی اب شریفوں کے گھر میں رہنے کے لائق نہیں۔

جیسا کہ میں نے کہیں لکھا ہے حبیب ذمہ دار سرکاری عہدہ دار تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے میرے رہنے کا انتظام اپنے ایک ہندو دوست کے یہاں کیا۔ یہ بھی سرکاری ملازم تھے۔ بائیں بازو کی تحریک سے متاثر اور لازماً غیر متعصب تھے لیکن ان کی بیوی چھوت چھات، پوجا پاٹ کرنے والی کٹر ہندو تھی۔ میرا خفیہ نام شیلا تھا اور میری میزبان کو بتایا گیا تھا کہ میں کسی دوسرے شہر سے اپنے پتی کے ہمراہ پٹنہ گھومنے آئی ہوں۔ مجھے سخت ہدایت تھی کہ ان کے چوکا (باورچی خانہ) میں جا کر کھانے پینے کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں کیونکہ اگر کبھی آنے والے دنوں میں انہیں معلوم ہو گیا کہ میں مسلمان ہوں تو پتی پتنی میں گھمسان کارن پڑے گا۔ شامت اعمال یہ کہ ایک شام جب وہ چوکا میں کھانا بنا رہی تھیں، ان کے چھوٹے گود کے بچہ نے جو رونا شروع کیا تو روتے روتے بلکان ہو گیا، لیکن بہلانے میں ذرا نہ آیا۔ ازراہ ہمدردی میں نے بچہ انہیں تھمایا اور چوکا میں جا کر سارا رسوئی بھرشٹ کر دیا جو انجانے میں انہوں نے کھا لیا، لیکن میں پھر اپنے اصلی روپ میں کبھی اپنا منہ انہیں دکھانے کی ہمت نہ کر سکی۔

انڈر گراؤنڈ دور کا دوسرا کلاسیکل لطیفہ جو یاد آرہا ہے، وہ بھی سناتے چلیں۔ ہمارے سیل کی ایک اہم رکن میڈیکل کالج کی طالبہ شبانی تھی۔ ایک میٹنگ میں اس نے بتایا کہ سنیل مکرجی سیکریٹری بہار کمیونسٹ پارٹی نے اسے پروپوز کیا ہے اور پارٹی ڈسپلن کے ماتحت اسے اس معاملہ میں اپنے سیل سے اجازت چاہئے۔ اب ہماری سمجھ سے بالاتر یہ بات کہ کوئی کمیونسٹ لیڈر، جو کل وقتی رکن پارٹی ہے، شادی اور رومانس کی بات کیسے کر سکتا ہے۔ کمیونسٹ کو تو میری سمجھ کے مطابق قربانی تیاگ کے علاوہ ہر دوسرے جذبہ سے بے نیاز ہونا چاہئے۔ اس معنی میں ہم خود اپنے آپ کو مورد الزام سمجھتے تھے کہ رشتہ کے بندھنوں کی وجہ سے ہم پارٹی کے لئے وہ کچھ نہیں کر سکتے جو کرنا چاہئے۔ ویسے بھی ہم نے شادی کی تو نہیں بلکہ طاقت پرواز

آنے سے پہلے ہی کر دی گئی، لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ بال دپر بھی ہمیں انہی کے تعاون سے حاصل ہوئے۔ بہت سے کامریڈ شادی شدہ بھی تھے جن کی شادیوں کے پس منظر سے ہم واقف نہ تھے۔ چنانچہ ہم نے شبانی سے بہت سنجیدگی سے پوچھا کہ کیا پارٹی کے لیڈران ویسے ہی محبت اور رومانس کی باتیں کرتے ہیں جیسے عام لوگ کرتے ہیں۔ اس بات کا خوب چرچا پارٹی میں ہوا اور ہماری سادہ لوحی کا خوب مذاق اڑایا گیا۔

جاوید کی طبیعت خراب ہوئی۔ ہزار کمیونسٹ سہی لیکن ممتا تو دھڑکنا نہیں بھولتی ہے نا! پارٹی کی سخت تاکید تھی کہ گھر کسی حال میں نہ جاؤں کہ ایسے میں گرفتاری کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، پر دل نہ مانا۔ شام کو ایک غیر مشکوک دوست کے ساتھ پردہ والی گاڑی سے گھر پہنچ گئی۔ بچہ کو تیز بخار تھا اور بے سدھ ہو رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ رات ہی کو اپنے خفیہ ٹھکانے پر واپس چلی جاتی، لیکن پھر دل اور جذبات کے کہنے میں آکر چوک ہو ہی گئی اور میں رک گئی۔ دوسرا سارا دن خیریت سے گذرا۔ سردیوں کے موسم اور دسمبر کے مہینے میں ...... شام کا جھٹپٹا ہو چلا تھا کہ دروازہ کی گھنٹی بجی۔ حبیب اٹھ کر باہر گئے اور چند منٹ بعد میرے پاس آکر زیر لب مجھے پکارا۔ میں نے بھانپ لیا کہ کیا بات ہے۔

"آگئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" ان کا مختصر جواب تھا۔ اس وقت بچہ میری گود میں تھا اور میں اسے چمچہ سے دوا پلا رہی تھی۔ میں نے بچہ انہیں تھماتے ہوئے کہا،

"آپ گھر کی تلاشی لینے کے لئے انہیں اندر لے آئیں اور اگر وہ مجھے دیکھ لیں تو میری گرفتاری میں مزاحمت نہ کیجئے گا۔" اس کے بعد ہم نے کیا کیا، اسے سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ ویسے یہ ناتجربہ کاری کا اقدام ضرور تھا، لیکن بچکانہ یا بے وقوفی کا اقدام نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں میرے موجود رہنے کے باوجود حبیب

پولیس کو غلط بیان دیں کہ خود ان کے پھنس جانے کا خدشہ تھا ۔ اپنے لئے بچنے کا ایک چانس لینا تھا ۔ مجھے تو یہ احساس جرم تھا کہ پارٹی کی ہدایت کے خلاف میں نے گھر آنے کی جرأت کی تھی ۔ اگر گرفتار ہو گئی تو پارٹی کو کیا جواب دوں گی ۔ اس زمانہ میں ، میں دبلی پتلی چھوٹی سی لڑکی ہوا کرتی تھی ۔ میلے کپڑے رکھنے کا بکس تھا جس کے چاروں طرف جالی لگی ہوئی تھی ۔ یہ ایک اونچے سے پلنگ کے نیچے پڑا رہتا تھا ۔ میں نے آسانی سے اس میں گھس کر پٹ بند کر دیا اور جالی سے پولیس والوں کی نقل و حرکت دیکھتی اور ان کی باتیں سنتی رہی ۔ پہلے تو انہوں نے کہا کہ انہیں گھر کی تلاشی نہیں لینی ہے ، صرف زہرا داؤدی کو گرفتار کرنا ہے جو باوثوق اطلاعات کے مطابق کل رات گھر آئی ہیں اور جنہیں واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا ہے ۔ حبیب کو پارٹی کی بھی ہدایت تھی کہ وہ ہر حال میں نوکری بچائے رکھنے کی کوشش کریں کہ اسی صورت میں وہ غیر قانونی پارٹی کے لئے زیادہ کارآمد ہو سکتے تھے ۔ بہرحال پولیس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا ، صرف پلنگ کے نیچے سے میلے کپڑوں کا صندوق نکال کر نہ دیکھا ۔ مجھے گرفتار ہونے کا ڈر تو نہیں تھا ، لیکن یہ ڈر اور شرمندگی ضرور تھی کہ پارٹی کی ہدایت کے خلاف میں گھر گئی تھی اور عام برژوائی ماؤں کی طرح بچہ کو گود میں لئے بیٹھی تھی ۔ سو اس جرم کی پاداش میں کہیں پارٹی سے نکال نہ دیا جائے ، تقریباً ایک سال انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد پارٹی قانونی ہوئی تو میں گھر واپس آئی ۔

کیمونسٹ پارٹی نے ابتدا میں تو نظریاتی طور پر تحریک پاکستان کی حمایت نہ کی ، لیکن جب متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کثیر اکثریت اس تحریک کے ساتھ ہو گئی تو کیمونسٹ پارٹی نے پارٹی کے مسلمان ارکان کو ہدایت کی کہ وہ پاکستان بننے کے حق میں ووٹ دیں ۔ پارٹی کے فیصلہ کو چیلنج کرنے کی نہ تو ہمت تھی نہ اعتماد ہم نے بھی مسلم لیگ کی حمایت میں ووٹ دیا اور لیگ کے امیدوار کی کامیابی کے

لئے دوسری لیگی لڑکیوں کے ساتھ حتی المقدور کام کیا۔ الیکشن کے روز سارا دن الیکشن بوتھ پر رہے اور جائز و ناجائز جس کے بارے میں شک ہوا کہ لیگ کی مخالف ہے، اسے چیلنج کرتے رہے۔ لیکن دل نے کبھی اس حرکت کے لئے نہ مجھے سراہا نہ معاف کیا۔ مارکس کے مطابق سرمایہ دارانہ استحصالی نظام میں جمہوریت محض چھوٹی سی اقلیت کے لئے ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ استحصالی معاشرہ میں جمہوریت کا مساوات اور طاقت ور کے ہاتھوں کمزوروں کی لوٹ کھسوٹ کی بیخ کنی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پھر یہ مارکسزم کا کون سا نکتہ تھا جس نے مسلمان پارٹی ممبروں سے اس ریاست کے قیام کی حمایت بھی کرائی اور ایک حد تک ان سے جدوجہد بھی کرائی۔ یہ تو زیادہ تر لوگ اب تسلیم کرنے لگے ہیں کہ پاکستان، جو اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا، بعد میں فقط ابھرتے ہوئے مسلمان سرمایہ داروں کو ہندو سرمایہ داروں سے ریاستی تحفظ عطا کرنے کا فرض انجام دینے لگا۔

میرا اپنا مسئلہ یہ تھا کہ میرے والد مولانا علی اصغر مرحوم کٹر کانگریسی اور نیشنلسٹ مسلمان تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں سرگرم حصہ لیا۔ بعد میں خرابی صحت کے باعث عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر تقریباً گوشہ نشین ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن میں نے انہیں صرف ہاتھ کا بنا ہوا کھدر کا لباس پہنتے دیکھا کہ بدیشی کپڑوں کو جلانے کے بعد جو کھدر کا استعمال شروع کیا تو آخر تک اس پر قائم رہے۔ راجندر بابو اور مولانا آزاد سے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ یہ لوگ جب بھی پٹنہ آتے، ابا سے ملنے ہمارے گھر ضرور آتے۔ ابا مسلمانوں کی مسلم لیگی سیاست سے سخت بیزار تھے اور انہیں انگریزوں کا پٹھو اور ہندوستان میں ان کے نوآبادیاتی مفادات کا محافظ کہتے تھے۔ چنانچہ مجھے گھٹی میں جو سبق ملا، وہ تھا بدیشی آقاؤں سے نفرت کرنا۔ میں مذہبی منافرت اور ہندو مسلم دشمنی کو انگریزوں کی حکومتی ہتھکنڈوں

کی پیدا کردہ چال اور مادر وطن کی تقسیم سمجھتی تھی ۔ اس کے حامی تو میری نظروں میں مکمل طور پر ناقابل قبول تھے ۔ انگریزوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ جب ہم بیت بازی کھیلنے بیٹھتے تو آغاز اس شعر سے کرتے تھے:

فرنگی کو مارا بڑی دھوم سے
لبا لب پیالہ بھرا خون سے

جیسا کہ کہیں بیان کر چکی ہوں بچپن سے لڑکپن کی دہلیز تک آتے آتے مارکسزم، کمیونزم اور کمیونسٹ پارٹی کی خاصی چھاپ ذہن پر پڑ چکی تھی ۔ ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کا عظیم الشان جلسہ پٹنہ میں ہوا ۔ ہمارے اسکول اور کلاس کی تقریباً سبھی مسلمان بچیاں اس جلسہ میں اپنے والدین کے ہمراہ شریک ہوئیں ۔ دوسرے روز اسکول میں ساری مسلمان لڑکیاں بڑی پرجوش تھیں کہ " اب تو بن کے رہے گا پاکستان ۔ " خوب خوب میری ان سے بحث ہوئی کہ پاکستان کا نعرہ مادر ہند اور آزادی وطن کی تحریک کے ساتھ غداری ہے ۔ مجھے متفقہ طور پر کافر قرار دے دیا گیا ۔ میری مسلمان دوستوں اور اس روز سے صرف چند مسلمان لڑکیوں کے علاوہ میری بات چیت سبھوں سے جو بند ہوئی سو ہوئی ۔ ہماری ساری دوست غیر متعصب مسلمان یا ہندو تھیں ۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو کانگریس نے برطانیہ کی جنگی کوششوں میں تعاون کے لئے کچھ شرائط پیش کیں جنہیں آزادی ہند کی صورت میں منتج ہونا تھا ۔ روس کا چونکہ ہٹلر کے ساتھ معاہدہ تھا، اس لئے جنگ کو سامراجی مفادات کے تحفظ کی ایسی جنگ قرار دے کر اس سے لاتعلقی برتنے کی کمیونسٹ پارٹی کی حکمت عملی کی بنا پر پارٹی اور کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی اور پارٹی کانگریس سے باقاعدہ طور پر علیحدہ ہو گئی ۔ پھر جب ہٹلر نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور سوویت یونین کی سرزمین پر

حملہ آور ہوا تو کمیونسٹ پارٹی نے اسے عوامی جنگ قرار دے کر ہر طرح اتحادی طاقتوں کی امداد کو جائز قرار دیا۔ "QUIT INDIA" (انڈیا چھوڑ دو) کے نعرہ سے سرد مہری برتی تاکہ اتحادیوں کو جنگ جیتنے کے لئے سازگار ماحول ملے۔

جنگ ختم ہونے سے لے کر تقسیم ہند اور قیام پاکستان تک کا عرصہ تقریباً دو سال پر محیط ہے۔ مسلمانوں کی کثیر اکثریت تقسیم ہند اور ہندو مسلم فسادات کی زد میں آ کر پناہ لینے پاکستان پہنچی، لیکن جن کے ہاتھوں میں نوزائیدہ حکومت کی باگ ڈور آئی، وہ ایسے موقع پرست تھے جن کا واحد مقصد بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا تھا۔ ان میں سیاسی لیڈر اور نوکر شاہی کے اعلیٰ عہدہ دار شامل تھے۔ نوکر شاہی کے وہ اعلیٰ عہدہ دار جنہوں نے پاکستان کے لئے آپٹ کیا تھا۔ پارٹی کی طرف سے سرخ لیڈروں کی بھی ایک کھیپ پاکستان بھیجی گئی کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کو پاکستان میں منظم کریں۔ کچھ حسن ناصر شہید کی مانند شہید کر دیئے گئے، کچھ راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ہوئے اور رہائی کے بعد یا تو ہندوستان واپس چلے گئے یا اسٹبلشمنٹ کی لیڈر شپ سنبھال لی۔ باقی اپنی اپنی بساط کے مطابق اب تک اپنی مساعی میں جٹے ہوئے ہیں۔ ویسے اب تو وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا اور جب ایسا ہو تو ہر چڑیا کو اپنا اپنا راگ علیحدہ الاپنا پڑتا ہے اور اب تو عالمی روش کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کا مقصد "سرمایہ دارانہ نظام" کو فروغ دینا ٹھہرا۔ ہنگری میں تو RED BARONS کی اصطلاح چل پڑی ہے۔ یہ RED BARONS سرمایہ دار امرا کا وہ طبقہ ہے جس نے پارٹی کے پرانے رہنماؤں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

"انقلاب روس کی دو منفرد مثبت خصوصیات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس انقلاب نے انسانی تواریخ کو ایک نیا موڑ اور اس کے مستقبل کو ایک نئی منزل عطا کی۔ منزل گرد راہ

سے اٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ روس کا اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب تاریخ عالم کا سب سے پرامن انقلاب کہا جاتا ہے۔ KERENSKY کی حکومت کا خاتمہ اور انقلابی قوتوں کے ہاتھوں اقتدار کی منتقلی نہایت ہی پرامن طریقہ سے عمل میں آئی۔ زار شاہی کے فوجی افسروں نے غیر ملکوں کی ریشہ دوانیوں کی مدد سے ملک میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکائی، لیکن بالشویکوں نے مارکسزم اور شوسلزم کے نام پر عوام کی حمایت حاصل کی اور اندرونی مخالفت کو کچل کر سوویت حکومت قائم کی۔ پھر دوسری جنگ عظیم میں شہر کی فوجیوں کو فیصلہ کن ہزیمت بھی روس ہی کے مورچہ پر ہو گئی۔ اس شکست نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ ہیروشما اور ناگاساکی پر تو کہتے ہیں کہ بلاضرورت ہی بمباری امریکا نے کی۔

جس انقلاب کو اتنے مختصر عرصہ میں اتنی آزمائشوں سے گذرنا پڑا، اس کے لئے امریکا کے مدمقابل عالمی طاقت بن کر ابھر آنا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ انقلاب فرانس کی اہمیت اپنی جگہ، مساوات، آزادی اور بھائی چارے کے نعرے بے شک ذہنوں اور ملکوں میں انقلاب لے آئے، لیکن جلد ہی یہ نعرے اپنی عملی افادیت کھو بیٹھے۔ یہ کریڈٹ روس کے انقلاب کو جاتا ہے کہ سامراجی طاقتوں کے سامنے اس نے نہ اپنی راہ چھوڑی نہ منزل میں تبدیلی کی۔ انسانی پیداواری اور تہذیبی رشتوں میں مکمل تبدیلی سوویت یونین اور وہاں کی کمیونسٹ حکومت کا نصب العین ہے۔"

سوویت یونین کی سترھویں سال گرہ کے موقع پر یہ میرے خیالات تھے جو

میں نے اپنی ڈائری میں قلم بند کر لئے تھے ۔ ابھی اپنی خودنوشت میں انہیں شامل کرنے کا محرک یہ جذبہ ہوا کہ ان برسوں میں خود اپنا جائزہ لے سکوں کہ ذہن پر سے جمود کی کتنی کائی ہٹ سکی ہے ۔ دراڑ تو عقیدہ اور عقیدت میں پڑنا پہلے ہی سے شروع ہو گئی تھی ، لیکن ڈر لگتا تھا کہ تنکا ہی سہی ، یہ بھی ہاتھوں سے چھوٹ گیا تو ڈوبنا ہی انسانیت کا مقدر ہو کر رہ جائے گا ۔ ویسے حالیہ انتخابات میں روایتی کمیونسٹ عناصر کی کام یابی سے نئی امیدوں کی کرن پھوٹی ہو یا نہیں ، لیکن خوشی بہت ہوئی :

اک مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لئے

# سنگم

ہمارا خاندان سرخ خاندان کہلاتا تھا ۔ ہم نے پارٹی کی ہدایت کے تحت مسلم لیگ کو ووٹ تو ضرور دیا تھا ، لیکن پاکستان جس نام اور منافرت کی بنا پر بنا تھا ، اسے کبھی قبول نہ کر سکے ۔ ویسے کبھی پتا بھی نہ چل سکا کہ سوویت یونین نے کس مصلحت کی بنا پر انڈیا کی کمیونسٹ پارٹی سے تقسیم ہند کی حمایت کرائی ۔ کبھی لگتا تھا کہ پارٹی الیکشن کا بائیکاٹ بھی تو کر سکتی تھی ۔ اصل میں شاید یہ لوگ اس خوش فہمی میں رہ گئے کہ پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر اگر مسلم لیگ پاکستان جیت لے گی تو یہ لوگ مسلمانوں کا دل جیت لیں گے اور کمیونسٹ پارٹی پاکستان میں زیادہ موثر طریقہ پر اپنا کردار ادا کر سکے گی ۔ خیر! پارٹی کی اس مصلحت کوشی کا نتیجہ یہ ہوا:

نہ خدا ہی ملا ، نہ وصال صنم

۱۹۶۴ء میں ہم لوگ کلکتہ میں تھے اور بڑے سکون و اطمینان سے رہ رہے تھے کہ مشرقی پاکستان میں فسادات ہوئے ۔ رد عمل کے طور پر کلکتہ میں بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور خوب ہوئے ۔ حبیب بہت زیادہ متاثر اور دل شکستہ ہوئے انہیں

دنوں ہمارے بھائی علی اطہر، جو کراچی میں کامیاب وکالت کر رہے تھے، اپنے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں کلکتہ آئے۔ ان دنوں کراچی بہت زیادہ ماڈرن اس معنی میں تھا کہ وہاں کا معیار زندگی جدید ترین اور مغربی طرز کا تھا۔ میرے بھیا اکثر کلکتہ آتے تھے۔ حبیب اور ان سے خوب گاڑھی چھنتی تھی اور جانے مایوسی اور گھور اندھیارے کی کون سی انتہا نے ان سے پاکستان ہجرت کر جانے کا فیصلہ کرا دیا۔ میرے لئے ان کا یہ فیصلہ بم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔ ہم نے کبھی خواب میں بھی پاکستان ہجرت کر جانے کی بات نہ سوچی تھی۔ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ انہوں نے مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی کر لیا۔ یہ بھی میرے لئے بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ ہم جاہلانہ روایات اور فرسودہ خیالات سے تو باغی تھے، لیکن حبیب کا کوئی اقدام کبھی ایسا ہوا ہی نہ تھا کہ مجھے ان سے ٹکر لینے کی ضرورت پڑتی۔ انہوں نے ہمیشہ میری سیاسی اور نظریاتی سرگرمیوں اور مشاغل میں میرے ساتھ تعاون کیا۔ ہر قسم کے خطرات اور دوسروں کے اعتراضات کے باوجود اتنا زیادہ انہوں نے میرا ساتھ دیا تھا کہ میں نے مرضی نہ ہونے کے باوجود پاکستان ہجرت کے فیصلہ کو خاموشی سے قبول کر لیا۔ حبیب کی والدہ اور بھائی بہنوں کو یہ غلط فہمی نہ جانے کیوں ہو گئی کہ اس نقل مکانی میں میرا ہاتھ تھا۔ مزہ کی بات یہ ہوئی کہ ہم نے انہی دنوں قانون کا امتحان پاس کر کے کلکتہ میں وکالت شروع کی تھی، چنانچہ پیشہ ورانہ ڈگری کی بنا پر مجھے امیگریشن مل گئی۔ حبیب ریلوے میں سینئر عہدے پر تھے لیکن پیشہ وارانہ ڈگری نہ تھی، سو وہ وزٹ ویزا پر آئے۔ پاکستان آنے کے بعد امیگریشن تو ملی، لیکن واپس ہندوستان جانا پڑا۔ امیگریشن کے کاغذات لینے کے لئے ستمبر کی پہلی کو وہ تنہا انڈیا گئے۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پاک بھارت جنگ چھڑ گئی اور وہ انڈیا ہی میں پھنس کر رہ گئے اور راستہ کھلنے کے بعد جب پاکستان واپس آئے تو سال کے اندر ہی چل بسے۔ خوف اور عالم شکستگی میں کئے

گئے ان کے فیصلہ نے ان کے لئے تو صلیب کا کام کیا۔

جب ہم لوگ انڈیا سے ترک وطن کر کے پاکستان آئے تو اس وقت یہ اندازہ نہ تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان نفرت کے شعلے اس حد تک بھڑک چکے ہیں کہ اتنی جلدی جنگ چھڑ جائے گی، چنانچہ ہمارے ساتھ صرف دو چھوٹے بچے آئے۔ باقی دو جو وہیں کراچی میں زیر تعلیم تھے، انہیں وہیں رہنے دیا گیا۔ ویسے بھی ان دنوں پاکستان میں امیگریشن ان لوگوں کو آسانی سے مل جاتی تھی جن کے پاس پیشہ ورانہ ڈگری ہوتی تھی۔ میں نے دو سال پہلے ہی لا گریجویشن کیا تھا اور کلکتہ ہائی کورٹ میں بحیثیت وکیل رجسٹرڈ تھی، چنانچہ ہم اور بچے تو امیگریشن لے کر آئے حبیب کو وزٹ ویزا ملا تھا۔ یہاں آکر انہیں امیگریشن ویزا ملا۔ چونکہ وہ ریلوے میں تو سینئر عہدہ پر تھے لیکن صرف بی۔ اے۔ تھے، اس لئے انہیں اپنے امیگریشن کے کاغذات دلی سے حاصل کرنے تھے۔ ہم پاکستان میں نئے نئے وارد تھے۔ سیاسی تعلقات کی سنگینی کا اندازہ نہ تھا، چنانچہ یکم ستمبر کو حبیب تنہا اپنا امیگریشن لینے کے لئے انڈیا چلے گئے۔ جنگ چھڑ گئی اور ہم ادھر تم ادھر والا معاملہ ہم لوگوں کے ساتھ ہو کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ حبیب سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ غنیمت ہے اسی دوران ہمیں پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کالج میں علم سیاسیات کی لکچرار کی حیثیت سے نوکری مل گئی اور روٹی، کپڑے، مکان کا فوری مسئلہ حل ہوا۔ جنگ بندی ہوئی تاشقند معاہدہ نے نئے مستقبل کی نوید دی۔ آج کے مانند اس زمانہ میں بھی ریڈیو پاکستان کے ذریعہ صحیح حالات سے واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ صرف سبز باغ کے خواب دکھائے جاتے تھے۔

مارچ ۱۹۶۶ء میں یکایک حبیب آپہنچے۔ وہ برسوں کے بیمار نظر آرہے تھے اور ذہنی، جذباتی اور نظریاتی شکست خوردگی کی مجسم تفسیر۔ ہندوستان چھوڑتے ہی نت

نئے مسائل اور دکھوں نے آخر دم تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور وہ کینسر کا مرض لگا بیٹھے
ایک تو ترک وطن کا مرحلہ یوں بھی مشکلات سے بھرپور ہوتا ہے ، لیکن حبیب کے
لیئے تو وہ جان لیوا ہی ثابت ہوا کہ وہ ان ساری اقدار سے منہ موڑ کر آئے تھے جو ان
کا (اور بنی نوع انسان کا) بڑا قیمتی اور انمول ورثہ ہیں ، یعنی مذہبی رواداری ، انسانی
مساوات پر یقین کامل اور محبت و اخوت ، لیکن یہ سارا کرب تو ان کے ساتھ میں نے
بھی جھیلا ، اور جب وہ تھک کر مجھے چھوڑ گئے تو تنہا ہی طوفانوں سے نبرد آزما ہوتے
رہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد اپنے سارے دعووں کے باوجود عورت سے بہت کم زور ہے
جب وہ ڈوبنے لگتا ہے تو ہمت ہار کر پتوار پھینک دیتا ہے ۔ عورت تنکے کے سہارے
بھی تیر سکتی ہے ۔

حبیب صرف ایک ہفتے جناح ہاسپٹل میں رہے ۔ اس سے پہلے کچھ دنوں ہلکا
بخار آیا کیا ۔ ان گنت ڈاکٹروں نے دیکھا اور یہی کہا کہ تھکن اور پریشانی کی وجہ سے
حرارت رہتی ہے ۔ جس روز اسپتال میں داخل ہوئے ، اسی روز رات کو کینسر
اسپیشلسٹ نے مجھے بلا کر کہا کہ پھیپھڑوں کا سرطان آخری درجہ پر ہے اور زیادہ سے
زیادہ ایک ہفتے کے مہمان ہیں ۔ ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر کیسے دوڑتی ہے ، اس
کا بھی تجربہ مجھے ہونا تھا ، سو ہوا ۔

تنویر ، میرا بڑا لڑکا ، پشاور میں پڑھ رہا تھا ۔ باقی تینوں ، یعنی جاوید ، ناہید اور
ندیم ، کراچی میں میرے پاس تھے ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ حبیب کو ان کے مرض کا پتا
نہیں لگنے دیں گے ۔ صرف ایک بار انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ انہیں کیا مرض ہے ۔
چونکہ سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی تھی ، ہم نے بات بنائی کہ ڈاکٹر نے نمونیا بتایا
ہے ۔ خاموش ہو گئے ۔ مجھے شک ہے کہ انہیں اپنے مرض کی سنگینی کا علم کسی ذریعہ
سے ہو گیا تھا اور اپنی دانست میں انہوں نے مجھ سے اور بچوں سے یہ بات چھپانے کی

کوشش کی ۔

انسان ہزار کوشش کرے، وہ اپنی تقدیر کا کاتب کب بن سکتا ہے ۔ دل کی آواز پکار اور آہ و زاری عرش تک گئی لیکن ٹکرا کر بے اثر واپس آگئی اور وہ یکم فروری ۱۹۶۷ء کو سارے اپنوں کو پیاروں کو اپنی ضعیف اماں، بھائی، بہنوں اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر "ہمہ اوست" میں ضم ہو گئے (جیسا کہ مجھے اب تک لگتا ہے) روپوش ہو گئے ۔ تو یہ تھے حبیب جو مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا کر خود جینے کا ڈھنگ نہ برت سکے ۔

وہ جو کہتے ہیں کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے کبھی نہیں جاتا، بالکل صحیح ہے ۔ پاکستان ۱۹۶۵ء کے جولائی میں آئے ۔ ۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۶۶ء میں کسی وقت حبیب واپس آئے ۔ اس دوران مجھے پی ۔ ای ۔ سی ایچ ۔ کالج میں علم سیاسیات کے لکچرر کی حیثیت سے سروس مل گئی ۔ نئے حالات سے زیادہ نئے ماحول سے سمجھوتا کرنا میرے لئے بڑا کٹھن ثابت ہوا، خصوصاً حبیب نے بھی جب ساتھ چھوڑ دیا ۔ انڈیا سے واپسی کے فوراً بعد میری اماں کا انتقال ہوا اور مہینوں کے اندر ہی حبیب بھی ساتھ چھوڑ گئے ۔ اماں اور حبیب دونوں ہی میری زندگی کے دو اہم ستون رہے تھے اور تب احساس ہوا کہ بیچ منجدھار میں بغیر پتوار کے ناؤ کو ڈوبنے سے بچانا کیا ہوتا ہے ۔

کراچی آکر اپنی دانست میں ہم نے اپنے آپ کو سیاست سے بھی علیحدہ رکھا اور مارکسی خیالات کو بھی نہاں خانہ دل میں روپوش رکھنے کی سعی کی، لیکن جیسے عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، اسی طرح شاید انسان کا سرخ ماضی بھی اپنا اعلان آپ کرتا ہے ۔ ایوب خان کا آخری دور تھا ۔ بنگلہ دیش اور مجیب کی للکار عروج پر تھی ۔ پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن نے کچھ مطالبات حکومت سے کئے اور ان کی منظوری تک چوبیس گھنٹے کی علامتی بھوک ہڑتال کا فیصلہ کیا جس میں تین، تین اساتذہ

باری باری چوبیس گھنٹے کی بھوک ہڑتال کرنے والے تھے۔ اساتذہ کے دو گروپ کے بعد ہم نے تادم مرگ بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ میں نے ایک روز پہلے ہفتہ بھر کا کھانا پکا کر فریز کر دیا۔ ان دنوں ویسے بھی میری صحت بہت خراب تھی، چنانچہ بچوں کو میں نے بھنک بھی نہ لگنے دی کہ وہ پریشان ہو جائیں گے۔ شام کے اخبارات میں جب بھوک ہڑتال کی خبر چھپی تو انہیں معلوم ہوا۔

ایک مزے کا لطیفہ اس سلسلہ میں یہ ہوا کہ میرے بڑے بھائی علی اطہر صاحب کو کورٹ میں کسی نے بتایا کہ ایک میمن خاتون زہرا داؤدی نے تادم مرگ بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے۔ بھوک کا پہلا ہی دن تھا، چنانچہ ہم چاق و چوبند تھے اور یہ لطیفہ سن کر خوب ہنسے۔

کچھ بہی خواہوں نے بھیانک انجام سے ڈرایا۔ میرے ماضی کے سرخ "کرتوتوں" کی سیاہ رپورٹ انڈیا سے یہاں سی۔آئی۔ڈی کو پہنچ چکی تھی اور اگر انہیں دنوں ایوب خان کی حکومت کا تختہ الٹ نہ جاتا تو یقیناً میرا مقدر جیل خانہ ہوتا لیکن ان دنوں صورت حال یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کی مقبولیت عروج پر تھی اور ہم پیپلز پارٹی کے جوشیلے کارکنوں میں تھے، سو ہماری کالج کی پرنسپل بھی جن کو ہماری ماں، شوہر اور بھائی کے یکے بعد دیگرے مرنے پر اعتراض تھا، اب اپنے رویہ پر پچھتا رہی تھیں۔ مرنے پر اعتراض کی بات کی تفصیل کہیں آگے بیان کریں گے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان پر اپنا تسلط دائمی بنانے کی کوشش میں ہندو مسلمان کے علیحدہ مفاد کی باتیں کی تھیں۔ قانون ساز اداروں میں مختلف زبان اور تہذیب کی بنا پر نہیں بلکہ مذہب کی بنا پر علیحدہ نمائندگی دی۔ آہستہ آہستہ مذہبی منافرت کی اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی کہ مسلمان، جو مٹھی بھر تعداد میں ہندوستان آکر ہندوؤں کے ملک اور دلوں دونوں پر راج کرنے لگے تھے، اتنا مایوس اور پست

ہمت ہو گئے کہ کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی انہیں ہر سمت سے ہندو بھوت دبوچتا ہوا محسوس ہونے لگا اور یہ کہ جب تک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ نہ بنے بحیثیت مسلمان ان کی بقا ممکن ہی نہیں، چنانچہ خون اور آگ کی ہولی کھیل کر پاکستان بنا، مگر خیالی بھوت کا نفسیاتی خوف سے پیچھا نہ چھوٹا اور بھارت کا خطرہ ہر طرف سے منڈلاتا نظر آتا رہا۔ پھر یہ خیالی بھوت اس قدر پاکستانیوں کے ہوش و حواس پر مفاد پرست طبقوں کی کوششوں کے طفیل غالب آیا کہ پاکستان کو پاکستانی مسلمان بھی ہندو بھوت دکھائی دینے لگا، چنانچہ آپس ہی میں لڑ بھڑ کر اپنے مزید ٹکڑے کر ڈالے۔ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو مغربی پاکستان نے کبھی اپنے ایسا مسلمان مانا نہ محب وطن اور تو اور وہ انہیں بھارت سے قریب تر اور اپنے سے دور تر سمجھتے اور کرتے رہے۔

انڈیا میں داہنے بازو کے سیاست دان بھی قربانیوں کی بھٹی میں تپ کر لیڈر بن کر ابھرتے دیکھے تھے۔ پاکستان جب آئے تو ایوب خان کا دور دورہ تھا۔ پھر فوراً ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی۔ ڈکٹیٹر ایوب کے چہیتے، بھٹو نامزدگی کے ذریعہ سیاسی آسمان کے افق پر ابھرے اور ریشہ دوانیوں، دھمکیوں اور تشدد کی کارروائیوں کے ذریعہ (مغربی پاکستان) عوامی لیڈر اور نمائندہ بن بیٹھے۔ لیڈری کے اس طریقہ کار سے کبھی ذہنی سمجھوتا نہ ہو پایا۔

۱۹۶۵ء میں جب پاکستان ہجرت کر کے آئے تو ابتدا کے کئی سال غم جاناں اور غم دوراں، دونوں ہی سے نبرد آزما ہوتے گذرے۔ زمانہ بڑے سے بڑے غم کی مرہم پٹی کر کے اسے قابل برداشت بنا دیتا ہے۔ سو وہی ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ کالج کی نوکری سے ایک تو روٹی روزی کا سہارا ہوا، دوسرے ہم خیال لوگوں سے عملی رابطہ پیدا ہوا اور جس خول میں انڈیا سے آنے کے بعد بند ہو گئے تھے، اس سے باہر نکلنے کا

موقع ملا۔

کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت تو پاکستان میں کبھی نہیں لی، لیکن وسیع اور محدود، دونوں ہی معنوں میں، وفاداریاں انہیں کے ساتھ رہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے روٹی، کپڑے اور مکان کے نعرہ نے بے حد متاثر کیا، لیکن دل اٹکا رہا ولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) میں، کیونکہ انڈیا کی ماسکو نواز کمیونسٹ پارٹی کا اس زمانہ میں اسے ہم زاد سمجھا جاتا تھا۔ نیپ کے بھاشانی گروپ اور ولی خان گروپ کے سیاسی اختلاف کیا تھے، یہ نہ تب ہمیں معلوم ہو سکا نہ اب۔ تب اس لئے نہیں معلوم ہو سکا کہ جس گروپ کے لوگوں سے رابطہ ہوتا تھا، وہ دوسرے کو "نظریاتی غدار" کہتے تھے، اور ہمارے ذاتی حالات اور ملکی واقعات ایسے پے در پے کروٹیں بدل رہے تھے کہ کچھ سمجھنے سمجھانے کا ذہنی ماحول ہی نہ بنتا تھا، چنانچہ بھاشانی گروپ کے لوگوں سے بھی رابطہ رہا اور ہم پیپلز پارٹی میں انہیں کے ذریعہ باقاعدہ شامل ہوئے تھے۔

یہ وابستگی بہت تھوڑے عرصہ قائم رہی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مسٹر بھٹو کا رویہ مشرقی پاکستان اور مجیب کے ساتھ ہمیں متاثر تو کیا کرتا، بھٹو کی نیت اور ارادوں کے بارے میں ہمیں بدظن ہی کرتا گیا۔ مجیب کے چھ نکات سے ہمیں مکمل اتفاق تو نہ تھا، لیکن مشرقی پاکستان کو کچلنے اور مجیب کی کل پاکستان میں انتخابی فتح کو شکست میں بدلنے کے لئے اور اسے وزیراعظم کے عہدہ سے دور رکھنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے، اس نے ہمارے سوچ کا رخ بدل دیا۔ جب پاکستان کے بننے نہ بننے کے سوال پر مسلمانوں میں استصواب رائے ہوا تھا تب ہم لوگوں کو پارٹی کی ہدایت کے مطابق مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کرنی پڑی تھی۔ منطق اس کی یہ تھی کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت تخلیق پاکستان کی حامی ہے،

اس لئے عوامی رائے اور منشا کا ساتھ دینا عین مارکسزم کا تقاضا ہے۔ چنانچہ شعور کے بیک گراؤنڈ میں یہی پارٹی لائن تھی۔ سو ہم نے فکری طور پر مجیب کا ساتھ دیا۔ عملی طور پر بس یہی کیا کہ خاموشی کے ساتھ پیپلز پارٹی سے ناتا توڑتے گئے۔ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی سے کبھی متنازعہ سیاسی مسائل پر ہماری اپنی دانست میں کوئی واضح اور CONSISTENT لائحہ عمل شاید کبھی نہیں رہا۔

## مارچ ۷۱ء

## میری ڈائری کا ایک صفحہ

" سمجھ میں نہیں آتا کہ مشرقی پاکستان کے حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ ویسے میں نے باقاعدہ طور پر پیپلز پارٹی میں شمولیت تو اختیار کر لی ہے، لیکن مسٹر بھٹو کی پالیسی سے مجھے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ مجھے تو یہ شخص واقعی بڑا موقع پرست اور اقتدار کا صرف بھوکا ہی نہیں بلکہ اس کی خاطر کچھ بھی کر گذرنے والا معلوم ہوتا ہے۔ الیکشن کے بعد کا سارا سیاسی بحران اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور پھر اس کے دعووں میں تو تضادات کی بھرمار ہے۔ جمہوری اقدار کو پاؤں تلے روندنے میں آج یہ حال ہے تو پھر کہیں بھٹو کو اقتدار مل گیا تو جانے کیا ہوگا! یہ تو اب طے ہے کہ بھٹو کے ہاتھوں ملک میں سوشلزم تو کیا سوشلزم کا "س" بھی آنے سے رہا۔ بھلا جو شخص فوجی آمریت کے تعاون سے اس حد تک جا سکتا ہے کہ ملک کے ساڑھے سات کروڑ عوام کی متفقہ آواز اس کے سامنے بے معنی ہو کر رہ جائے، جمہوریت لانے کی امید کہاں کی جا سکتی ہے؟ مسٹر بھٹو

کا رویہ، بیانات اور دھمکیاں، پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان روز بروز سنگین سے سنگین حالات پیدا کر رہی ہیں۔ گتھیاں سلجھنے کے بجائے الجھتی ہی جا رہی ہیں کہ ڈور کا سرا مغربی پاکستان کے ہاتھوں میں ہے اور یہاں کی اکثریتی جماعت کے رہنما بھٹو کے اقتدار حاصل کرنے کے مفاد میں ہے کہ یہ ڈور سلجھنے نہ پائے بھلے ٹوٹ جائے۔"

مارچ ۱۹۷۲ء میں ہم نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

"جولائی ۱۹۷۱ء کے بعد آج قلم اٹھایا ہے۔ اس دوران لکھنے کو دل نہ چاہا، ایسی بات نہ تھی۔ دل تو خوب ہی چاہا، واقعات اور حادثات بھی پے در پے ہوئے، مگر خیالات اور قلم میں سمجھوتا نہ ہو سکا۔

سیاسی افق پر تو آسمان بڑا ہی طوفان خیز رہا۔ پاکستانیوں کے لئے قیامت آئی اور اب تک چلی آ رہی ہے۔ ایک تو مشرقی پاکستان کا ظلم و تشدد کے خلاف آواز اٹھانا ہی قرب قیامت کی دلیل تھی۔ پھر ستم بالائے ستم کہ بنگلہ دیش حقیقت بن کر نئی ریاست کی حیثیت سے ابھرا اور مغربی پاکستان کے سینہ پر مونگ دلنے کے لئے قائم و دائم رہے گا۔ ویسے پیپلز پارٹی کے رہنما بھٹو کا اقتدار کا خواب بھی اسی صورت میں عملی جامہ پہن سکتا تھا سو انہوں نے مزید وقت ضائع کئے بغیر بنگلہ دیش کو تسلیم بھی کر لیا۔"

ان دنوں بھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پیپلز پارٹی کے علاقائی لیڈروں کو بے وقوف کہوں یا سادہ لوح یا ناعاقبت اندیش یا منافق۔ بظاہر تو ان میں سے کسی

کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا نہ سوچ میں نہ عمل میں۔ پیپلز پارٹی کے چین نواز لیڈران بس اپنے آپ کو مارکس کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی حالت مسلمان ملا کی ہے جو فتویٰ دیتا ہے۔ اکثر مسلمان ملا اسلام کی روح سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اللہ میاں کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پیپلز پارٹی کے لیڈران مارکسزم کو تو کیا سمجھیں گے، لیکن چین کے حمایت کے توسط سے اپنے آپ کو مارکسزم کی شرح کا واحد حق دار سمجھتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ میں نے پیپلز پارٹی کو ایک کم زوری اور مجبوری کے تحت جوائن کیا تھا۔ کم زوری یہ کہ اس جماعت نے انتخابات (۱۹۷۰) سے پہلے بڑی ہمت اور نڈرتا سے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا۔ پاکستان میں اس وقت اس بے جگری سے سوشلزم کے نام پر انتخابات میں حصہ لینے کا اعتماد کسی دوسری جماعت میں نہ تھا اور سوشلزم میری کمزوری ہے، خواہ وہ لنگڑا کیوں نہ ہو۔ مجبوری یوں کہ اگرچہ ذہنی طور پر ولی نیپ کے سوشلسٹ عناصر کے نقطہ نظر سے قریب تر تھی، مگر کراچی میں اس وقت نہ تو نیپ اور پیپلز پارٹی میں کوئی انتخابی سمجھوتا ہوا تھا اور نہ میرے حلقہ انتخاب سے نیپ کا کوئی امیدوار۔ مجبوراً مجھے اشتراکی عناصر نہ ہی اشتراکیت کے نام سے محبت کی خاطر پیپلز پارٹی جوائن کرنی پڑی، مگر پیپلز پارٹی میں بھی جو لوگ مجھے نزدیک سے جانتے ہیں، میرے نقطہ نظر سے خوب واقف ہیں۔ مجھے پیپلز پارٹی یا اس کے لیڈران سے یہ امید کبھی نہ تھی کہ یہ لوگ واقعی ملک میں سوشلزم لائیں گے یا اس کی سعی بھی ایمان داری سے کریں گے۔ آنکھوں میں دھول جھونکنے والی بات علیحدہ ہے۔ میرے خیال میں ساری منافقت کے باوجود ایک اہم تواریخی کام، جسے پیپلز پارٹی نے انجام دیا، وہ ہے اشتراکیت اور جمہوریت کے تصور کو پاکستان میں عوام کے نزدیک قابل قبول بنانا۔ اس پارٹی کے عروج سے پہلے ملا یا مذہب کے ٹھیکے داروں کے ہاتھوں میں بڑا سستا نسخہ اپنی اشاعت اور اشتراکیت کی بیخ کنی کا یہ تھا

کہ جہاں کسی نے اشتراکیت کے لئے اپنے دل میں کسی نرم گوشہ کا اظہار کیا تو انہوں نے اسے کافر، ملحد اور مرتد کے فتویٰ سے نواز دیا۔ اکثریت عوام کی یہ سمجھتی تھی کہ اشتراکی لازماً کافر ہوتے ہیں اور اس لئے ان کی مخالفت عین اسلام ہے۔ انتخابات میں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی کامیابی نے ملاؤں کا منہ کم از کم عارضی طور پر تو بند ہی کر دیا، لیکن انتخابات میں کامیابی کے بعد پیپلز پارٹی اپنا ترقی پسند کردار ادا کرنے کے بعد اپنے اصلی روپ میں جلد ہی ہمارے سامنے آگئی۔ اس میں مجھے تو نہ پہلے کوئی شک تھا نہ اب ہے کہ بھٹو بنیادی طور پر آمرانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ میں ان سے پہلی بار پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک ہفتہ کی بھوک ہڑتال کے بعد ملی تھی۔ ان دنوں ایوب خان کا تختہ الٹنے کے بعد یحییٰ برسراقتدار آئے تھے۔ دوسری بار ملی تو انہوں نے پیپلز پارٹی کے اساتذہ کی علیحدہ تنظیم بنانے کی ہدایت دی۔ یہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے فوراً بعد کا دور تھا، لیکن جس ڈھنگ سے وہ باتیں کر رہے تھے، مجھے ان سے تکبر کی بو آرہی تھی۔ بھٹو بنیادی طور پر مجھے آمرانہ ذہنیت کے مالک لگے۔ وہ عوامی سیلاب کے دھارے کو اپنے حق میں موڑنا بے شک جانتے تھے۔ ان کا واحد نصب العین پاکستان کا عظیم ترین مرد آہن بننا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہیں جمہوریت اور اشتراکیت کا گلا گھونٹنے میں بھی تامل یا عار نہیں تھا، تبھی تو عوامی رہنما کہلائے جانے کے باوجود حکومت کرنے کے لئے انہیں جمہوریت کے نام پر حاصل کیا ہوا منصب بہت ذلیل لگا اور ابتدا کرنے کے لئے مارشل لا سے کم اقتدار نظروں میں نہیں جچا۔

شہری اور جنگی قیدیوں کی پہلی کھیپ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۳ء میں پاکستان پہنچی۔ ان کی آمد پر شادیانے بجائے گئے اور زبردست استقبال ہوا۔ ان کی آبادکاری میں بھی کوئی خاص دقت نہ ہوئی کہ مجاہد جو تھے۔ دوسرا قافلہ دوسرے ہی روز، یعنی ۳۰ ستمبر کو، پہنچا۔ انہیں بھی غازی اور مجاہد اعلان کیا گیا۔ ان کے صبر و استقلال اور

استقامت کی داستانیں سنتے سنتے کان پک گئے۔ عقل نے یہاں ساتھ چھوڑ دیا کہ یہ غازی ہیں تو شکست خوردہ فوج کیا ہوتی ہے۔ انہوں نے صبر و استقلال کا مظاہرہ ہندوستانی فوج کے سامنے سرنگوں ہو کر کیوں کیا اور پھر وہ دو لاکھ اردو بولنے والے پاکستانی، جنہوں نے چند برسوں ہی کے اندر دو بار، پہلی بار پاکستان کی تخلیق کی خاطر اور دوسری بار پاکستان کی بقا کی خاطر، اپنے آپ کو لٹایا، وہ کس جرم میں بے گھر، بے در چھوڑ دیئے گئے۔ ہندوستان میں ان جنگی قیدیوں کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس کی بربریت اور اذیت ناکی کا بھی خوب چرچا ہوا۔ ویسے ٹی۔ وی پر جتنے جنگی اور شہری قیدی واپس آتے ہوئے دکھائے گئے، وہ اچھے خاصے تن درست و توانا نظر آئے عورتوں کی گودمیں ایک ہفتہ کی عمر تک کے بچے تھے۔ پھر بھی یہاں یہ گلہ کیا جاتا رہا تھا کہ ان لوگوں پر مزید نفسیاتی ظلم یہ کیا گیا کہ میاں بیوی کو ملنے جلنے کی آزادی نہ تھی جیسے یہ لوگ انڈیا دشمن کی قید میں نہ تھے بلکہ ہنی مون منانے گئے تھے، حالانکہ نومولود بچوں کی موجودگی ہنی مون ہی کے نظریہ کو تقویت بخشتی ہے۔

حبیب کا انتقال ہوا تو میں نے ایک ہفتہ کی چھٹی کی۔ مجھے تو یہ بدگمانی یا خوش گمانی تھی کہ اس اسلامی ریاست خداداد میں بلامعاوضہ یا بامعاوضہ عدت کی مدت تک کی فرصت ضرور ملے گی، لیکن ہفتہ کے اندر ہی کالج کی پرنسپل مالکہ کی وارننگ ملی کہ اگر فوراً ڈیوٹی پر حاضر نہ ہوئی تو کسی اور لکچرر کو میری جگہ رکھ لیا جائے گا۔ اس وقت میرے چھوٹے سے بڑے چاروں بچے زیر تعلیم تھے۔ دو وقت کی روٹی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا کہ نوکری داؤ پر لگانے کی عیاشی کر سکتے، چنانچہ ایک ہفتہ بعد ہی کالج جانے لگی۔ کالج کی ترقی پسند بانی کے آفس میں رپورٹ کرنے گئی تو بجائے تعزیت اور ہمدردی کے دو بول کے، میرے ہاتھ میں نئی روٹین تھما دی۔ اب تک روزانہ بی۔ اے کی دو کلاسیں اور ایک انٹر سیکنڈ ایئر کی کلاس لیتی تھی۔ اب جو مجھے

روٹین ملی ، اس کی رو سے فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کے سارے سیکشن میرے حوالہ کئے گئے ، یعنی فرسٹ پیریڈ سے آٹھویں پیریڈ تک مسلسل ۔ احتجاج بے کار تھا کہ نوکری مالکہ کی جبیں پر شکن پڑنے سے جا سکتی تھی ۔

حبیب کے انتقال کے ایک ہی ماہ بعد میرے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا ۔ جس روز ان کا انتقال ہوا ، صرف اسی روز کالج چھٹی کے لئے درخواست بھیجی ۔ دوسرے روز کالج گئی تو کالج کی مالکہ کے آفس میں طلبی ہوئی ۔ میں رو رہی تھی ۔ بھلا جس کا بھائی اور شوہر مہینے بھر کے وقفہ سے ختم ہو جائے ، وہ روئے نہیں تو کیا کرے! بیگم صاحبہ نے مجھے آخری وارننگ دیتے ہوئے فرمایا ،

" آپ کے یہاں ہر روز لوگ مریں گے تو کالج چھٹی تو نہیں دے سکتا ۔ "

ویسے ہمارے کالج کی مالکہ بہت کلچرڈ دانش ور اور اونچے معاشرہ میں ہر دلعزیز شخصیت ہیں ، لیکن بلند پایہ شخصیت ہونے کے لئے انسان دوستی ، ہمدردی اور شرافت کی شرط کہاں لکھی ہے ؟

۱۹۷۰ کے انتخابات ہوئے ۔ ملکی سطح پر مجیب کو اکثریت حاصل ہوئی ۔ بھٹو صاحب کو بھی اقتدار چاہئے تھا ، چنانچہ " ادھر ہم ادھر تم " کا نعرہ انہوں نے لگایا ۔ تبھی سے میرا بھروسا پیپلز پارٹی پر سے بالکل ہی اٹھ گیا ۔ میرے خیال میں اقتدار مجیب کو ملنا چاہئے تھا کہ پاکستان ایک ملک تھا اور انتخابات کے غیر جانب دار ہونے کو کسی جماعت نے چیلنج نہیں کیا تھا اور شاید جمہوریت کے اس بنیادی اصول ، یعنی اکثریتی پارٹی کی حکومت پر عمل کیا جاتا تو آج متحدہ پاکستان کی تواریخ کہیں زیادہ مثبت اور خوش گوار ہوتی ۔ لیکن خواہ پیپلز پارٹی ہو یا کچھ دوسرے بااثر عناصر ، مشرقی پاکستان کے سلسلہ میں سبھی کا گٹھ جوڑ تھا اور یہ عناصر اس وقت کے مشرقی پاکستان کو اپنی نوآبادی بنانے پر تلے ہوئے تھے ۔

پولٹکس میرا مضمون تھا۔ کلاس میں لڑکیوں سے سوال وجواب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میرے خیال میں مجیب کی عوامی پارٹی کو حکومت بنانے کا موقع ملنا چاہیئے۔ ان دنوں کالج کی مالکہ نے ایک دوسری خاتون کو، جن کی تقرری میرے ہی ساتھ ہوئی تھی، عارضی پرنسپل کے عہدہ پر فائز کر رکھا تھا۔ ہم دونوں ہی بہاری، لیکن وہ متعصب اور موقع پرست اس حد تک کہ بنگالی مسلمانوں کو بھی اپنے پائے کا مسلمان نہ سمجھنے پر فخر تھا، چنانچہ بچہ سقہ کی ایک روز کی بادشاہت میں انہوں نے مجھے آفس میں طلب کیا (یہ خاتون بیگم صاحبہ کی منہ چڑھی خوشامدی تھیں) اور مجھے ایک خط دیا جس میں درج تھا:

"اگر مجیب سے آپ کو اتنی ہی محبت ہے تو مشرقی پاکستان جا کر اس کے ساتھ اپنی راتیں رنگین کریں تو آپ کے لئے زیادہ بہتر ہو گا۔" پے در پے صدموں نے یونہی حواس مختل کر رکھے تھے۔ پھر غم جاناں اور غم دوراں دونوں سے بیک وقت نمٹنا۔ خاموشی کے سوا چارہ نہ تھا۔ سر جھکائے واپس آگئی۔ اللہ نہ کرے کسی انسان کا پالا "دین وایمان کے ٹھیکے داروں" سے پڑے!

پاکستان آتے ہی پاکستانی کلچر کا مژدہ سنا۔ سورج کا چراغ ہاتھوں میں لے کر تلاش کر ڈالا۔ کتابوں کے علاوہ پاکستانی کلچر کہیں نہ ملا۔ ہاں! سندھی، پنجابی، بنگالی اور پٹھان کلچر سے ہر جگہ ٹکراؤ ہوا یا اس کلچر سے جو ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مہاجرین ہندوستان سے اپنے ساتھ اپنی شناخت کے ساتھ لائے تھے۔ کلچر یا تو قومی ہو گا یا علاقائی۔

مارچ ۱۹۷۹ء کی ۲۰ تاریخ تھی۔ ۱۱ بجے جیسے ہی تھرڈ ایئر بی۔ اے۔ کی کلاس میں داخل ہوئی پرنسپل کا بلاوا آیا۔ آفس میں داخل ہوئی۔ پرنسپل ہاتھ میں ایک لفافہ لئے ہوئے تھیں خاموشی کے ساتھ انہوں نے میری طرف بڑھا دیا۔ میں کھٹک گئی۔

ضرور دال میں کچھ کالا ہے ۔ یہ میری برطرفی کا حکم نامہ تھا ۔ MIS CONDUCT کے الزام میں فوری برطرفی ہو گئی ۔ مجھے اس برطرفی پر افسوس تو ضرور ہوا ، لیکن تعجب نہیں ہوا ۔ ایک تو پاکستان میں اشتراکی ذہن رکھنا بذات خود بہت بڑا جرم ہے دوسرے پیپلز پارٹی سے نزدیکی تعلق ۔ (گو وہ تعلق کب کا ٹوٹ چکا تھا) قانونی چارہ جوئی کی تمنا تھی ، کیونکہ نوکری میری معاشی اور ذہنی ضرورت تھی ، لیکن مالی وسائل نے قانونی چارہ جوئی کی اجازت نہ دی ۔ اس زمانہ میں چند روپے بڑے گراں قدر لگتے تھے ۔

کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کوئی فرشتوں کی جماعت تو تھی نہیں کہ اپنے ایک ممتاز رہنما ، سابق سیکریٹری اور صدر کے لئے کوئی اقدام اٹھاتی اور خوشامد ، سفارش ، پیروی میری فطرت نہ تھی ۔ کیس کے ٹائم بار ہونے کے بعد اتفاقاً کہیں بیرسٹر کمال اظفر سے ملاقات ہوئی ۔ کہنے لگے ،

" آپ نے مجھے بتایا ہوتا ۔ میں آپ کا کیس لڑتا ۔ " بیرسٹر ودود (مرحوم) کو بھی مجھ سے یہی شکایت رہی کہ میں نے وقت پر ان سے رابطہ قائم نہیں کیا ۔

جن دنوں میں پاکستان ہجرت کر کے آئی ، جنریشن گیپ کا نام تو بہت سنا تھا ، لیکن کلچرل شاک کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا ۔ بس اتنا جانتی تھی کہ مغرب اور مشرق کی تہذیب کے اقدار جدا جدا ہیں ۔ مغرب اور مشرق ندی کے دو کنارے ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے ۔ ہاں ! ایک بات اور وہ یہ کہ کچھ لوگ باہر تعلیم یا کسی اور سلسلہ میں جا کر وہاں سے انگریزی تہذیب کا لبادہ اوڑھ کر واپس آتے تو ان کا بہت تمسخر اڑایا جاتا اور وہ " کالا صاحب " یا " ٹیڈی بوائے " کہے جاتے ۔

ایک میری دوست تھیں جنہوں نے لندن جا کر ہندی ساہتیہ میں ودیالنکار کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ تب انگلینڈ ڈگری لینے کے لئے امرا اور رؤسا کے علاوہ دوسرے جانے والے صرف وہ ہوتے تھے جنہیں قسمت کا دھنی ہی کہا جا سکتا ہے ۔ سو وہ بات

بے بات لندن سے ہندی لٹریچر میں ریسرچ کرنے کا تذکرہ کرتیں تو ہم لوگوں کی جان ہی تو جل جاتی تھی ۔ ابھی ۱۹۹۲ء میں انڈیا گئی تو پٹنہ میں ایک مشترکہ دوست کے یہاں پینتیس سال بعد ان سے ملاقات ہوئی ۔ شکل سے تو نہیں لیکن وید لنکار کی ڈگری سے انہیں فوراً پہچان لیا ، لیکن یہ سب کچھ تو بس سرراہ یاد آگیا ۔ اصل واقعہ تو کلچرل شاک کے سلسلہ کا تھا ۔

میرا پہلا کلچرل شاک ، جس نے مجھ سے زیادہ دوسروں کو میری عاقبت کے خراب ہونے کے اندیشہ سے دہلا دیا ، وہ کچھ یوں تھا کہ شامت اعمال سے میرے کالج جوائن کرنے کے ایک ، دو ہفتہ کے اندر ہی کالج کی ایک استاد حج مبارک کا مبارک فریضہ انجام دے کر واپس آئیں ۔ اپنے ساتھ آب زم زم لے کر اسٹاف روم میں ہم سب ٹیبل کے گرد بیٹھے ۔ وہ ایک چھوٹے سے گلاس میں آب زم زم کا تبرک سبھوں کو پلا رہی تھیں ۔ میری مصیبت یہ کہ میں انڈیا سے تازہ نو وارد ۔ وہاں کے طریقہ رائج الوقت کے مطابق دوسروں کے جھوٹے گلاس میں پینے کا کیا سوال کہ گھر میں بھی ہر فرد کا گلاس علیحدہ ہوتا تھا ۔ ابھی میں ہر ایک کو جھوٹے گلاس میں پینے کے شاک سے نبرد آزما ہو کر اپنے لئے راہ فرار ڈھونڈنے کی سعی کرنے ہی والی تھی کہ شمع میرے سامنے آپہنچی اور جیسے فی البدیہہ مصرع موزوں ہو جائے ، اسی طرح بے ساختہ میرے منہ سے جملہ پھسل گیا کہ " ہم نہیں پئیں گے ۔ " آنے والے خطرات کے پیش نظر کوئی چیز چھن سے اندر ٹوٹ گئی ........ اس کے بعد جو چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں میرے عقائد کے بارے میں ہوئیں ، ان کی تفصیل نہ ہی بیان کروں تو بہتر ہے ۔ بہرحال یہ میرا پہلا کلچرل شاک تھا اور پھر تو پے در پے اس طرح کے دھماکوں سے واسطہ پڑنے لگا ۔

ٹیگور جس پایہ کے شاعر تھے، وہ نہ صرف بنگلا زبان کے بلکہ بین الاقوامی ادبی میراث کا درجہ ہم لوگوں کے لئے رکھتے تھے کہ ہم نہ زمین بانٹنے کے حامی تھے اور نہ

زبان بانٹنے کے قائل ، لیکن اس وقت کے مغربی پاکستان میں بنگلہ زبان میں کسی بھی تخلیق کو پاکستان کی میراث سمجھنا، ملت اسلامیہ کے لئے بڑی اہانت کی بات تھی کہ بنگلہ زبان سے ہندووانہ یا کافرانہ بو آتی تھی ۔ بے چارے بنگالی مسلمان بھی دوسرے درجہ کے مسلمان سمجھے جاتے تھے ۔ یہاں ہماری روایت یہ کہ متحدہ ہندوستان میں دو بڑی تہذیبوں کے سنگم سے کلچرل ٹکراؤ کی خلیج کو پاٹ رہے تھے ۔ مجھے اس کا ذرا اندازہ نہ تھا کہ پاکستان میں قدم قدم پر مذہبی منافرت اور دوئی کے عفریت سے پالا پڑے گا۔

جلد ہی یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ جس قدر زیادہ لوگ یہاں اسلام اسلام کرتے ہیں ، اتنا ہی زیادہ اسلام کی روح سے نابلد ، ناواقف اور جو واقف ہیں وہ قصداً گریزاں ہیں ۔ میلادیں عقیدت سے زیادہ سماجی فنکشن کے طور پر منعقد ہوتی ہیں جہاں کپڑوں کی زیبائش اور گلوکاری کا جادو دکھانے کا جذبہ زیادہ کارفرما رہتا ہے ۔ بہرحال چونکہ میں بھی مسلمان ہوں اور تازہ تازہ ہندوستان سے وارد، اس لئے میرے جذبہ ایمانی کو پاکستانی بنانے کے لئے جاننے والے میلاد اور سماعت درس قرآن میں شرکت کی دعوت ضرور دیتے ۔ ایسی ہی ایک دعوت ایک روز ملی ۔ بد قسمتی یہ کہ دعوت قبول کرتے وقت میں ذرا قیلولہ کے جھونک میں تھی ۔ سو میں نے سمجھا کہ جیسے عام طور سے قرآن خوانی اور میلاد ہوتی ہے ، وہی کچھ ہو گا ، چنانچہ رسم دنیا کے مطابق ایسا وقت دیکھ کر پہنچی کہ قرآن خوانی ختم ہو چکی ہو اور میلاد بھی نصف النہار پر ہو تاکہ ناشتے کے لئے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے ، مگر آج بد قسمتی نے پیچھا کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا ۔ جیسے ہی پہنچی ایک صاحبہ کلام پاک کی کسی آیت کی تفسیر کر رہی تھیں ۔ میں بھی بہت ادب سے سر ڈھک کر ان کی باتیں غور سے سننے لگی ۔ وہ تفسیر ختم کر کے شرک کی تعریف بیان کرنے لگیں ۔

" شرک صرف یہی نہیں ہے کہ آپ قادر مطلق کی حیثیت سے خدا کی ذات

میں کسی کو شامل کریں ۔ شعوری طور پر بلکہ اگر آپ نماز نہیں پڑھتی ہیں تو یہ بھی شرک ہے ۔" میں نے خوف زدہ اور ہراساں ہو کر نظریں مقررہ کے چہرہ سے ہٹالیں، کیونکہ مجھے محسوس ہوا کہ اب لوگوں کی نظریں میرے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں ۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا والی مثال اس وقت میری ہو رہی تھی ۔ کانوں میں مسلسل ہتھوڑے برسانے والی آواز چلی آرہی تھی،

"جب آپ نماز نہیں پڑھتی ہیں تو خدا کے حکم سے روگردانی کر کے اپنے نفس کے حکم کی پیروی کرتی ہیں، گویا آپ نے اپنے نفس کو خدا سے بڑا درجہ دیا اس لئے یہ فعل شرک سے بڑا گناہ ہوا، کیونکہ شرک میں تو دوسری ہستی کو خدا کے برابر کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن نماز چھوڑنے میں نفس کو اللہ سے بڑا درجہ دیا گیا ۔" بہت ڈرتے ڈرتے میں نے عرض کرنے کی جرأت کی،

" محترمہ! نماز نہ پڑھنے کا لازماً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خدائے بزرگ و برتر کے مقابلہ میں نفس کو برتری دی گئی بلکہ اکثر تو ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ چونکہ انسان خطا و نسیان کا مرکب ہے، اس لئے اس سے کوتاہی یا خطا سرزد ہو جاتی ہے ۔" بس صاحب! پھر کیا تھا ۔ محترمہ نے ایک قہرآلود نگاہ مجھ پر ڈالی اور فتویٰ صادر فرما دیا،

" اگر آپ کو مذہب پر اعتقاد ہوتا تو اتنی مقدس مجلس میں میری باتیں سن کر آپ ان پر فوراً عمل شروع کر دیتیں نہ کہ بحث ۔" جی چاہا کہ اسی وقت دث حرف ان پر بھیج کر فوراً اٹھ جاؤں، لیکن ناشتے کے برتن کھڑکھڑا رہے تھے اور چائے پینے کی بے انتہا خواہش اندر سے اکسا رہی تھی اور پھر اتنا فائدہ میری بروقت دخل اندازی کا ضرور ہوا کہ مجلس تو منتشر نہ ہوئی، مگر لوگ جو بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ محترمہ کی شرک کے بارے میں گفتگو سن رہے تھے، ان کے اذہان ضرور منتشر ہو گئے ۔

اللہ جانے ان خود ساختہ مذہب کے ٹھیکے داروں کو کب عقل آئے گی ۔ اپنی

عاقبت کو وہ سنواریں یا بگاڑیں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، لیکن دوسرے سادہ لوح اور ایک خدا کے سچے پرستاروں کو تو ارکان اور احکامات خداوندی کی غلط تاویل دے کر گم راہ نہ کریں۔ ایسے ایسے جاہل تبلیغیوں کے طفیل صرف پاکستان نہیں سارے عالم اسلام کا یہ حال ہے کہ ایک دوسرے کو کافر اور ملحد و مرتد قرار دے کر مسلمانوں ہی کے خون سے ہاتھ رنگ کر اپنے کو شہید یا غازی کہلواتے ہیں۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر خاص طور پر اپنی سوانح میں اس لئے کیا ہے کہ یہ اور اس نوع کی بہت ساری دیگر چیزوں نے مجھ میں دیگر مذاہب کے مطالعہ کا شوق اور لگن پیدا کی جس کے نتیجہ کے طور پر مجھ میں مذہبی رواداری اور سیکولرزم کا شعور اور جذبہ پختہ سے پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے طوفانوں بھری زندگی کا ایک اور جذباتی لطیفہ سنانے کے لئے دل مچل رہا ہے، سو اسے بھی بیان کئے دیتی ہوں۔

تقسیم ہند سے پہلے یا یوں کہہ لیں کہ ۱۹۵۰ء سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں عورتوں میں بیداری اور جاگیرتی کی لہر خاصی تیز و تند ہو چکی تھی۔ سیاسی آزادی اور خواتین کی آزادی کی تحریک، دونوں متوازی چل رہی تھیں اور دونوں ہی تحریکوں کے روح رواں مرد و عورت دونوں تھے۔ آزادی اور نجات کی متوالی عورتیں اپنے باپ، شوہر بھائیوں اور بیٹیوں کو ظالم اور اپنی پست حالت کا ذمہ دار نہیں سمجھتی تھیں جن کے ساتھ گذارہ کرنا ان کی معاشی ضرورت ہو بلکہ جہالت، توہم پرستی، تعصب اور استحصالی نظام کو سمجھتی تھیں، چنانچہ مجھے بھی گھر میں ابتدائے عمر، سے جو ماحول ملا، وہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کے بنیادی فرائض یا یوں کہہ لیں کہ دائرہ کار گو کہ مختلف ہیں، لیکن بنیادی انسانی حقوق یکساں ہیں۔ کسی رشتہ کو دوسرے پر محض اپنے جنڈر (GENDER) کی بنا پر فوقیت یا اولیت حاصل نہیں ہے، لیکن مزے کی

بات یہ ہے جس کا بیان یہاں یقیناً دل چسپ ہو گا کہ اس انٹلکچوئل آزاد ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اور خود "بغاوت میری فطرت ہے، میں باغی ہوں تمدن سے" کا پیکر مجسم ہونے کے باوجود مجھے شوہر کے لئے "سرتاج" کا لفظ استعمال کرنا بڑا رومانٹک لگتا تھا اور جیسے جیسے بچپن کی حدود سے نکل کر لڑکی پن کی حدود میں داخل ہوتی گئی لفظ "سرتاج" کی کشش شعلہ کی مانند تیز ہوتی گئی۔ شادی کے بعد پہلا خط جو حبیب کو لکھا، اس میں بڑے ارمانوں سے "سرتاج" کا القاب استعمال کیا، لیکن جواب خط نے ارمانوں بھرے لقب پر پانی پھیر کر رکھ دیا۔ ان کا جملہ تھا:

"ایک سرخ انقلابی لڑکی کو اپنے شریک زندگی کے لئے 'سرتاج' لکھنا انتہائی بھدا ذوق ہے۔" خوشی تو بے حد ہوئی کہ میرا شوہر اتنا بڑا انقلابی ہے کہ برژوائی ذہنیت کے "سرتاجی" رشتہ کو بھی برداشت کرنے کا روادار نہیں ہے، لیکن اس حسرت نے پھر بھی دم نہ توڑا کہ کاش ہم اپنے سرتاج کو سرتاج لکھ سکتے۔ اب تو خیر کوئی بات نہیں ہے، لیکن ۱۹۵۰ء کے بہار میں عام بول چال میں کم از کم عورتیں کم ہی اپنے شوہروں کو نام سے مخاطب کرتی تھیں۔ میں نے وہ بھی کیا اور دھڑلے سے کیا۔

ویسے عورتوں کی آزادی اور حقوق کے چرچے اور تحریک تب بھی تھی اور اب بھی ہے، لیکن اب حقوق اور مساوات کا مطلب لغوی طور پر تبدیل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن عملی طور پر زمین و آسمان کا فرق ہے۔ صحیح معنوں میں نجات یافتہ (مارکسسٹ اور کمیونسٹ ہونے کے علاوہ) خاتون ہونے کے باوجود میرا ذہنی اور نظریاتی سمجھوتا ۱۹۷۰ء کے بعد کی فیمنسٹ تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد سے کسی سطح پر کبھی نہ ہو سکا۔ میں تو خواتین کی اس جاگیرتی کی قائل رہا کی جہاں غیر ملکی تسلط، جاگیردارانہ قوانین اور جاہلانہ رسم و رواج کے خلاف عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ جدوجہد کرتی رہیں۔

# فیمنزم

موجود دور میں نسائی برتری کی علم بردار پرجوش خواتین مجھے شدید احساس کم تری میں گرفتار محسوس ہوتی ہیں ۔ یہ ذہنی ، فکری اور جذباتی تشدد کا پرچم اٹھائے ہمارے آپ کے اور خود اپنے باپ ، بھائیوں ، شوہروں اور بیٹوں کے خلاف الزام تراشی کر رہی ہیں ، نفرت کا زہر اگل رہی ہیں اور انتقام کے شعلے بھڑکا رہی ہیں ۔ یہ فیمنسٹ خواتین اپنی صنف کی ڈھال لئے ہر اس خوب صورت اور مثبت طرز عمل ، جذبہ احساس ، روایت اور بندھن کو توڑنے کا عزم لے کر چلی ہیں جس کی تعمیر میں عورت اور صرف عورت پیش پیش رہی ہے ۔ یہ عورتیں اپنے آپ کو خواتین کی جاگیرتی اور نجات کا مجاہد کہتی ہیں ، لیکن عام نارمل عورت روز بروز ان سے اور ان کے غیر فطری مطالبات سے بدظن ہوتی جارہی ہے اور پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں جیسے امریکا سے آئے ہوئے مفلس افراد کے لئے لنڈے کے کپڑے کی کھپت ہوتی ہے ، اسی طرح لنڈے کی تحریکوں کی بھی مفلس ذہن و دماغ میں کھپت ہوتی جارہی ہے ۔ پھر بھی فیمنسٹ تحریک کا زیادہ تر زور صنفی جنگ کو تیز سے تیز تر کرنے میں لگا ہوا ہے ۔ جیسے کچھ عرصہ پہلے تک انسانی روا داری ، مساوات ، حقوق اور آزادی اور غیر استحصالی معاشرہ کے قیام کے لئے ہم لوگوں کا نقطہ نظریہ ہوا کرتا تھا کہ طبقاتی جنگ کو شدید تر کئے بغیر اور مسلح جنگ کے بغیر انسانیت کے دشمن سرمایہ دار کے نظام اور استحصال سے چھٹکارا ممکن نہیں اور یہ کہ مزدور طبقہ کی مکمل نجات کے لئے غیر طبقاتی معاشرہ کا قیام ضروری ہے جو سرمایہ دار کو مسلح جدوجہد کے ذریعہ فنا کئے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ اسی طرح فیمنسٹوں کی حکمت عملی کے مطابق ، عورت اور مرد

کے درمیان عدم تعاون اور نفرت کی جنگ شدید کئے بغیر اور موجودہ معاشرتی ڈھانچے کو ختم کئے بغیر عورتوں کو صحیح معنوں میں مردوں کی غلامی سے چھٹکارا نہیں مل سکتا اس سوچ کے مطابق لائحہ عمل نے سچی بات تو یہ ہے کہ عورتوں کو آزادی سے ہم کنار کرنے کی بجائے، ان کی ساری فطری صفات اور صلاحیتوں کو کچل کر رکھ دیا ہے صحیح معنوں میں اپنے انسانی حقوق اور مرتبہ حاصل کرنے، اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے سماج کی عائد کردہ ناجائز پابندیاں اور مصنوعی اور غیر فطری زنجیروں کو توڑ پھینکنے کا جوش و جذبہ معدوم ہو گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو خواتین کل تک فیمنسٹ تحریک کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی تھیں، آج اس کے غیر فطری مطالبات کی بنا پر اس سے بدظن ہوتی جا رہی ہیں، چنانچہ نوے کی دہائی میں پرانے طرز کے فیمنزم کی افادیت اور مقبولیت میں خاصی کمی آئی ہے۔ جس تیز رفتاری سے یہ خواتین کی جدوجہد میں ہراول دستہ کی مانند آگے بڑھی تھی، اس سے زیادہ برق رفتاری سے روبہ زوال ہے اور اکیسویں صدی سے پہلے پہلے تک اگر اس کے نظریہ اور مقاصد و مطالبات میں بنیادی تبدیلی نہ آئی تو اس تحریک کو شدید ردعمل اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کے واضح آثار موجود ہیں۔

نظریاتی طور پر آج فیمنزم نے پوری انسانی آبادی کو دو متحارب صنفوں میں تقسیم کر کے آمنے سامنے کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جانب طبقۂ ذکور ہے ...... ظالم، بے حس، عورتوں پر ظلم ڈھانے والا اور متشدد، جنسی استحصالی نظام کو برتنے والا۔ دوسری جانب بے چاری عورتیں مظلوم مردوں کی بربریت، تشدد و نفرت کا شکار، ہر غلطی اور انسانی کمزوری سے مبرا۔ اپنے حقوق اور حصہ کے لئے برسر پیکار ہیں۔

بیسویں صدی کا آخری عشرہ فیمنسٹ عورتوں کے لئے عشرت و کامرانیوں کی

دہائی رہا ہے۔ قیود کی ساری زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ مساوات کے لئے عورتوں کی جنگ آزادی کامیابی سے ہم کنار ہو چکی ہے۔ جس یونی ورسٹی میں عورتیں چاہیں داخلہ لے سکتی ہیں، لا فرم کو جوائن کر سکتی ہیں، بینک سے کریڈٹ لے سکتی ہیں۔ عورتوں کو وہ سارے مواقع، سہولتیں اور حقوق حاصل ہیں جو بعض حالات میں مردوں کو بھی حاصل نہیں ہیں۔ مثلاً عورت چاہے تو پیٹ میں پرورش پانے والے بچہ کو قانوناً قتل کر سکتی ہے باپ نہیں کر سکتا۔ پھر فیمنسٹ خواتین اتنے کرب، بے قراری اور الجھن کا شکار کیوں ہیں؟ آزاد اور مساوی شہری ہونے کے باوجود فیمنسٹ عورت اتنی مایوس اور اپنے جنڈر اور اناٹومی سے اتنا شرمندہ اور بے زار کیوں ہے؟ ہو سکتا ہے میری سوچ رجعت پرستی پر مبنی ہو، لیکن میرے خیال میں مختلف سروے رپورٹوں کا جائزہ کھلے دل سے لینے سے ایک حد تک یہ عقدہ حل ہوتا نظر آتا ہے۔

۱۔ گھریلو زندگی کو مکمل خیرباد کہہ کر اور مکمل طور پر پروفیشنل کیریئر اپنانے والی عورتیں بانجھ پن کی وبا کا شکار ہو رہی ہیں اور انہیں اپنی زندگی بے کیف اور بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ (نیویارک ٹائمز)

۲۔ جن عورتوں نے کیریئر بنانے کے چکر میں شادی نہیں کی، انہیں اب ڈھلتی عمر میں پسند کا آدمی شادی کے لئے نہیں ملتا۔

نیوز ویک کے تبصرہ کے مطابق غیر شادی شدہ عورتیں ہسٹیریا کا شکار ہونے کے علاوہ "خود اعتمادی" کے کرائسس سے دوچار ہیں اور ایسی عورتوں کی تعداد جو، نام نہاد آزادی اور کیریئر کے بعد بھی ذہنی کرب سے دوچار ہیں، بڑھتی ہی جارہی ہے اعصابی دباؤ، نشہ کی لت، دل کا دورہ وغیرہ نجات یافتہ فیمنسٹ عورتوں میں بہت بڑھ گیا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق فیمنسٹ عورتوں میں قابل اعتماد شریک

زندگی کی غیر موجودگی نے ان کی یکہ و تنہا زندگی کو ایک جیل خانہ میں تبدیل کر دیا ہے یہاں تک کہ بیٹی فرائڈن ، جو فیمنسٹ تحریک کی مورث اعلی ہیں ، نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اب عورتیں ایک نئی قسم کے دو شخصی شناخت (IDENTLITY CRISIS) کے بحران اور ایسے ہی کئی ذہنی اور جذباتی کرائسس سے دوچار ہو رہی ہیں جنہیں اب تک کوئی نام نہیں دیا جا سکا ہے ۔

تو یہ کون سا دکھ ہے جو ہر خواہش اور مطالبہ کے پورا ہونے کے بعد بھی ہر آزادی اور ہر سماجی ، معاشرتی ، قانونی اور اخلاقی بندھنوں سے چھٹکارے کے بعد بھی فیمنسٹ عورت کی جان کو روگ لگا رہا ہے ؟ گھر سے باہر بامعاوضہ کام کرنے والی عورتوں میں تقریباً ۸۰ فیصد عورتیں سیکریٹریوں اور معمولی صلاحیت کی نوکریوں پر کام کرتی ہیں ۔ جج ، قانون دان اور بڑی کمپنیوں کے منیجر ، چیرمین ، ڈائریکٹر ، یعنی پالیسی کا تعین کرنے والے کلیدی عہدوں پر فائز ہونے والوں میں ، عورتوں کا تناسب قابل افسوس حد تک کم ہے جبکہ یہ حقیقت شک و شبہ سے بالاتر تسلیم کی جا چکی ہے کہ دماغی اور ذہنی حیثیت سے عورتیں مردوں سے کم نہیں ہیں ۔ پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں ، جہاں عورتیں اب بھی بحیثیت مجموعی بہت سی ناانصافیوں اور ناروا سلوک ( DISCRIMINATION ) کا شکار ہیں عورتیں ہر میدان عمل میں مردوں سے آگے نکل رہی ہیں ، لیکن یہ بے چاری امریکا کی فیمنسٹ عورت شاید اگلی صدی تک بھی صدر امریکا بنے جانے کا خواب نہ دیکھ سکے ۔ وجہ صرف ایک ہے ۔ فیمنسٹ عورت انتہائی احساس کم تری کا شکار ہے ۔ وہ اپنی جنس سے شرمندہ اور مایوس ہے اور کوئی صورت اس جنس سے چھٹکارے کی نظر نہیں آتی تو اپنے قول و فعل سے ان مردانہ خصوصیات کو اپنانے کی کاوش میں گرفتار ہے جو اس کی اپنی فطری خصوصیات سے اسفل تر ہیں اور جنہیں اپنانا ناممکن ہے ۔

# فیملی ۲۰۰۱ء میں

اکثر سیاسی محققین کا کہنا ہے کہ خاندان، سماجی تنظیم کا قدیم ترین اور اہم ترین ادارہ ہے۔ خاندان کی اہمیت سے انکار کرنا یا اس کی مذمت کرنے کا مطلب مختلف سماجی اداروں کی افادیت سے انکار کرنا ہے۔ خاندان کے رکن کی حیثیت ہی سے فرد اپنے انفرادی وجود کے خول سے باہر نکل سکتا ہے، یعنی وہ دوسروں سے کچھ پانے اور دوسروں کو کچھ دینے کی صلاحیت اور شعور حاصل کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور انکشافات و ایجادات کا انسانی زندگی میں وجود ہی نہ ہوتا اور انسان آج بھی آفرنیش کے ابتدائی دور کی غیر متمدن زندگی گذار رہا ہوتا۔ جب انسان نے آفات فطری اور موسم کے سرد و گرم سے تحفظ حاصل کرنے کا ابتدائی طریقہ سیکھا، درختوں کی چھاؤں اور پہاڑوں کی گپھاؤں میں پناہ لینے کا ڈھنگ آیا تو فطری کشش کے باعث اس نے صنف مخالف کے ساتھ رہنا شروع کیا۔ غالباً قدیم ادوار میں ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے دماغی اور ذہنی صلاحیتوں سے زیادہ جسمانی طاقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ بات پتا نہیں چلتی کہ ان قدیم لوگوں نے (ماقبل تواریخ کے اس دور میں) مرد و عورت کے باہم مل کر مشترکہ پناہ گاہ میں رہنے اور نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچوں پر مشتمل اس ابتدائی تنظیم کے ڈھانچے کو کیا نام دیا۔ آگے چل کر جب انسانوں نے مختلف چیزوں کو مختلف نام دینا اور شعوری طور پر منظم ہونا شروع کیا تو اس تنظیم کا نام "خاندان" پڑا۔ خاندان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنف مخالف ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس طرح کی تنظیم کے وجود کے قائم رہنے کے لئے بنیادی شرائط آپس میں محبت، قربانی اور اعتماد

کا جذبہ ، فرائض کی تقسیم کاری اور ذمہ داری ہے ۔ حیرت کا مقام ہے کہ آج جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں تقسیم کاری اپنی حد کو پہنچ گئی ہے ، لوگ خاندانی زندگی کی تنظیم میں تقسیم کاری کی مخالفت کرتے ہیں ۔

ایک تحقیقی نظریہ کے مطابق انسانی معاشرہ کے بالکل ایام طفولیت یا ابتدائی دور میں خاندان کی سماجی اکائی میں " باپ " کا تصور ہی سرے سے ناپید تھا ۔ ماہرین آثار قدیمہ بڑے جوش و خروش سے اس امر کی تحقیق میں جٹے ہوئے ہیں کہ آیا بنی نوع انسان کے تہذیبی ارتقا میں " باپ " کی شمولیت تھی بھی یا نہیں ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ متنازعہ بات یہ ہے کہ آدم نے اپنی اولادوں کی نگہداشت میں کوئی مثبت کردار یا ذمہ داری نباہی تھی یا انہیں حوا سے بس دل بہلانے کی حد تک ہی دل چسپی تھی ۔

اگرچہ ان ماہرین احوال قدیمہ کو اب تک ایسے ٹھوس اور جامع شواہد نہیں مل سکے ہیں کہ ابتدا میں مرد ، خاندان اور بچوں کی دیکھ بھال ، پرورش و پرداخت کی ذمہ داری سے یکسر علیحدہ رہا ہے اور صرف ماں یا عورت نے بغیر مرد کے بچوں کی ساری ذمہ داری پوری کی ہے ، لیکن پھر بھی یہ ماہرین ، فیمنسٹ دباؤ اور ایک مخصوص نتیجہ پر پہنچنے کے لئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انسانی معاشرہ کی ابتدائی تواریخ سے ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس کی بنا پر " باپ " کو خاندان کا تسلیم شدہ فرد ہونے کا شرف بخشا جاسکے اور مرد کی حاکمیت یا سربراہی کا تو ابتدائی انسانی معاشرہ میں کوئی تصور یا سراغ ہی نہیں ملتا ہے ۔

SHIRE HITE * مغربی دنیا کے جانے پہچانے اور پرجوش فیمنسٹ ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ خاندانی ادارہ میں مرد کی شمولیت بہت بعد میں ہوئی ۔ ان کے مطابق اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ انسانی ارتقا کے ابتدائی دور میں لوگوں کو

استقرار حمل سے متعلق معلومات نہ تھیں۔ کافی عرصہ بعد جب لوگوں کو دونوں صنفوں کے ملاپ کے نتائج کی سائنسی معلومات ہوئیں تو خاندانی اداروں میں مرد کی اہمیت اور ضرورت محسوس کی جانے لگی۔یہی وجہ ہے کہ جب تک "باپ" کے رول کا علم نہ تھا ابتدائی انسان کی زبان میں "باپ" کے لئے کوئی لفظ بھی ایجاد نہ ہوا تھا۔ جب "باپ" کی اہمیت کا ادراک ہوا تبھی اس رشتہ کو نام بھی دیا گیا۔

لیکن انسانی تہذیب و تمدن کے ابتدائی دور کی چھان بین اور تحقیق کرنے والے افراد میں ایسے محققین کی بھی کمی نہیں ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ "خاندان" کی اکائی میں مرد کی حیثیت اور اہمیت ابتدا ہی سے تسلیم شدہ تھی اور یہ کہ انسانی معاشرہ کے کسی دور میں بھی اس کی حیثیت ثانوی یا اضافی نہیں رہی ہے۔ اس خیال کے حامیوں کا کہنا ہے کہ خاندان کے ادارہ کی جڑیں سماجی تنظیم میں بڑی گہرائی تک پہنچتی ہیں اور بہت اہم ہیں، چنانچہ مرد، یعنی باپ، بھائی یا شوہر کے بغیر سماجی تنظیم میں صرف عورت اور بچہ پر مشتمل سماجی ادارہ کی حیثیت سے خاندان کا وجود اور بقا ناقابل قیاس معلوم ہوتا ہے۔

ویسے "خاندان" کے ادارہ کے آغاز پر ریسرچ پر کشش اور پر خطر دونوں ہی ہے۔ انسان کی معاشرتی ترقی و ترویج کا کھوج لگانے والے ماہرین آثار قدیمہ سے لے کر تواریخی محققین تک سبھی خاندانی ادارہ کے وجود میں آنے کے محرکات اور اس کے مختلف ادوار کی بنیاد تک پہنچنے کے لئے سرگرداں ہیں۔ اس سلسلہ میں اکثر متضاد آرا ہیں اور اس بحران کے باوجود بھی، جس سے جدید دور میں روایتی خاندان اپنی بقا کے لئے برسرپیکار ہے، یہ حقیقت ہے کہ روایتی خاندان ہماری روزمرہ کی زندگی ہی کا نہیں بلکہ جیون مرن میں بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان زندگی کا ہر لمحہ خاندانی زندگی سے ہمہ جہت اتنا مربوط رہتا ہے اور اتنا زیادہ انحصار کرتا ہے کہ

خاندانی ادارہ کی بنیادی خصوصیات کی تشریح اور تجزیہ کرنا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ خاندان کو سماجی زندگی کا "جوہر حیات" کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

خاندان کی مسلمہ اہمیت کے باوجود بھی اس کے آغاز و ماہیت کے مسئلہ کو ایک علیحدہ موضوع تحقیق بنا لینا بہت سی مشکلات کو جنم دیتا ہے۔ جس طرح قانون سازی کسی معاشرہ یا دور کی مجموعی تہذیب و تمدن اور سماجی ارتقا کے مختلف منازل کی عکاسی کرتی ہے اور جس طرح پتھر کے کتبہ پر لکھی ہوئی عبارتیں قانون ساز کے ذہن کی مجرد ایجاد نہیں ہوتیں، اسی طرح مختلف ادوار میں خاندانی ادارہ بھی مختلف ہیئتیں (شکلیں) اپنے دور کے مطالبات کے لحاظ سے اختیار کرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک خاص تواریخی دور میں خاندانی ادارہ کی اپنی ایک ناقابل تبدیل مستقل سرحد ہوتی ہے۔ سماج یا انسانی معاشرہ مسلسل ارتقائی عمل سے دوچار رہتا ہے۔ انسانی معاشرہ، بشمول تہذیب و تمدن، علوم و فنون، سائنسی ایجادات و انکشافات وغیرہ، انقلابی نہیں بلکہ ارتقائی تبدیلیوں کے مرہون منت ہے کھوج اور تفتیش انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور معاشرتی اور مجلسی زندگی گذارنے کے لئے ہم جنسوں کی رفاقت و تعاون فطرت انسانی کا مطالبہ۔

اکثر ہوتا یہ ہے کہ جب ہم دوسرے ادوار کے انسانوں اور ان کے معاشرتی تنظیم کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ، اخلاقی یا غیر اخلاقی، فطری یا غیر فطری ہونے کی جانچ کا پیمانہ غیر لچک دار اقدار کو بنا لیتے ہیں اسی صورت میں عموماً ہماری تحقیقی کاوش کی رسائی ان لوگوں اور ان کے معاشرتی حالات کے تقاضوں اور ان سے وجود میں آئے والے اداروں تک نہیں ہو پاتی جنہیں ہم سمجھنا اور جاننا چاہتے ہیں۔ اکثر یہی کوتاہی خاندان اور خاندانی ادارہ کے آغاز اور ارتقا کا کھوج لگانے والوں سے بھی ہوتی ہے۔

ہمارے آج کے زمانہ میں "خاندان" سے مراد ہے۔ میاں، بیوی اور بچے یا متحدہ خاندان جہاں دو یا دو سے زیادہ نسل کے افراد مل کر رہتے ہوں۔ دور جدید میں مغربی ممالک اور شمالی امریکا میں "خاندان" کا ایک جدید ترین انقلابی یعنی غیر ارتقائی تصور بھی جنم لے رہا ہے جس میں خاندان صرف ماں اور بچہ پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ خاندان کا یہ تصور، جسے "واحد والدین" کا خاندان کہا جاتا ہے، فیمنسٹ تحریک کا شاخسانہ ہے جس میں مرد کی حاکمیت کا توڑ کرنے کے لئے عورتیں خاندان سے مرد کے نام کو ختم کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ اب اگر "واحد والدین" پر مشتمل خاندان کو معیار بنا کر ہم عہد قدیم میں خاندان کے آغاز کا کھوج لگانا چاہیں کہ ہماری موجودہ فیمنسٹ تحریک کا یہی مطالبہ ہے تو تحقیق کی جگہ یہ تجویز ضرور لے لے گی کہ بچہ کو باپ کے وجود سے شناخت کا پابند نہ بنایا جائے۔ مزید براں خاندانی زندگی اور ادارہ کے آغاز کی تفتیش دوسرے سماجی علوم سے کٹ کر علیحدہ دھارے میں نہیں کی جا سکتی۔ یہ رویہ خاندانی ادارہ کی تواریخ کو صحیح تناظر میں پرکھنے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ خاندانی ادارہ کی تواریخ عمومی تواریخی عوامل کے ایک اہم سنگ میل کا کام کرتی ہے اور اس کے صحیح مطالعہ سے قدیم معاشروں کی ترقی اور ارتقائی منازل کو سمجھنے میں معاونت ملتی ہے۔ گھریلو یا خاندانی ادارہ اور کسی خاص دور کے معاشی اور کلچرل اثرات باہم ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، اس کا بنظر غائر جائزہ اور مطالعہ ضروری ہے۔ گھریلو یا خاندانی ادارہ معاشرے کی وسیع تر تنظیم اور اقدار کا عکس ہوتا ہے اور اسے اسی زمانہ کے تمدن کے تناظر میں صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

جزویات میں اختلافات کے باوجود اکثر لوگ اس خیال کے حامی ہیں کہ قدیم خاندان میں ماں کی حیثیت مرکزی اور باپ کی ثانوی ہوا کرتی تھی۔ ماں یا عورت

کے قبیلہ کے گرد خاندان کی تنظیم ہوا کرتی تھی ۔ باپ خاندان کا فرد تو ضرور ہوتا تھا، لیکن اس کی حیثیت محض ضمنی تھی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں کے ساتھ کسی بھی جاندار کا تعلق جتنا فطری، گہرا اور جذباتی ہوتا ہے، وہ باپ کے ساتھ نہیں ہوتا ۔ باپ اور اس کے قبیلہ کے ساتھ تعلقات، سماج کے مقابلتاً زیادہ ترقی یافتہ دور ہی میں ممکن ہیں ۔ یہ مفروضہ بھی کہ ازدواجی تعلقات پر مبنی فیملی ہی قبیلہ اور ریاست کا نقطہ آغاز ہے، اکثر محققین کے خیال میں صحیح تواریخی عمل کو اوپر سے نیچے لانے کے مترادف ہے ۔ ڈارون کے پیش کردہ " ارتقائی عمل کا نظریہ " (ORIGIN OF SPECIES 1859) سے خاندانی ڈھانچے کے ابتدائی عمل کو سمجھنے میں کوئی معاونت نہیں ملتی ۔ انسانی ارتقا نہ تو متواتر، مسلسل اور مرتب رہا ہے اور نہ ایک جغرافیائی علاقہ کی تہذیب و تمدن، اسی دور کے دوسرے جغرافیائی علاقہ کی تمدنی اور تہذیبی عکاسی کرتا ہے ۔

خاندان ایک چہار دیواری کے اندر مرد و عورت اور ان کے بچوں کے ایک ساتھ رہنے سے وجود میں آتا ہے اور ایک خاص تہذیبی اور تمدنی نقطہ نظر کے ملاپ سے توانائی حاصل کرتا ہے ۔ آج بھی عام طور سے مشرقی ممالک کے خاندانی اداروں میں ابتدائی عمر سے فرد کو تحمل، اطاعت، آپس کے تعاون، ٹیم اسپرٹ، محبت، قربانی اور اشتراک عمل کا سبق ملتا ہے ۔ دوسری طرف افراد خاندان کو خاندان کے سرپرست کی طرف سے شفقت، تحفظ اور تعاون کا یقین ہوتا ہے، چنانچہ " خاندان " کی اہمیت اس کی اخلاقی اقدار کی بنا پر مزید مستحکم ہوتی ہے ۔ اخلاقی اقدار اور ایک دوسرے کے لئے قربانی اور مدد کا جذبہ خلا میں جنم نہیں لیتے ۔ ان کی بنیاد سماجی اداروں میں پیوست ہوتی ہے اور خاندان ہی سماجی ادارہ کی وہ اکائی ہے جہاں اخلاقی، جذباتی اور ہمہ گیر انسانی اقدار کی داغ بیل پڑتی ہے ۔

جس طرح خاندان، انسانی سماج کی اولین سیڑھی ہے، اسی طرح شادی،

انسان کی معاشرتی تواریخ کا قدیم ترین ضابطہ حیات ہے ۔ آج بھی عام طور سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ شادی خوشی اور طمانیت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ۔ اس کے باوجود اس سنگین حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ پچھلے تین ، چار عشروں میں شادی سے متعلق نظریات اور رویہ میں زبردست تبدیلی آگئی ہے ۔ ایسی تبدیلی جو سماجی تواریخ کے کسی دور میں نہیں آئی تھی ۔ ہزاروں سالوں سے ، غالباً اس وقت سے جب سے انسان نے تمدن کی سیڑھیاں چڑھنا سیکھا ، شادی کا ضابطہ ، خاندانی زندگی کا ستون رہا ہے ، چنانچہ ہر دور اور ہر جگہ اسے معاشرہ کی سرپرستی اور قانون کا تحفظ حاصل رہا ہے ۔ مرد و عورت کے ملاپ اور نسل انسانی کو فروغ دینے کا واحد صحت مند ذریعہ گردانا جاتا رہا ہے ۔ بچوں کے لئے تحفظ ، مصیبت کے وقت افراد خاندان کے لئے پناہ اور معاشی وحدت ، خاندانی اکائی کے طفیل ہی ممکن ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارہ کو ہر معاشرہ میں مذہب کی بھی سرپرستی حاصل رہی ہے ۔ اخلاقی بندھنوں نے شادی کے رواج کو مزید سہارا دیا ہے ۔

یہ امر تعجب خیز ہونے کے علاوہ فکر انگیز بھی ہے کہ ایک ہی نسل کے دوران تقریباً ۱۹۵۰ء کے اواخر سے لے کر تادم تحریر ، شادی کی اہمیت اور افادیت سے متعلق لوگوں کے رویہ میں زبردست تبدیلی آگئی ہے ۔ شادی کے ادارہ کو مغرب اور امریکا میں زبردست دھچکا لگا ہے ، چنانچہ مغربی ممالک میں نہ صرف شادیوں کا مجموعی تناسب کم ہوا ہے بلکہ طلاق کا تناسب بے تحاشا بڑھ گیا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ مرد و عورت کا بغیر کسی سماجی یا مذہبی بندھن یا ذمہ داری کے ایک ساتھ زن و شوہر کی مانند رہنا اور بچہ پیدا کرنا سماجی ، اخلاقی اور قانونی کسی بھی نقطہ نظر سے اکثر معاشروں میں قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا ۔

فی الحال شادی کے ادارہ پر مختلف اطراف سے زد پڑ رہی ہے ۔ مختلف معاشی

نظاموں کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ ، اخلاقی اور انسانی و سماجی اقدار میں انقلاب ، جنسی آزادی اور انفرادیت پسندی نے شادی کے رویہ پر بڑا منفی اثر مرتب کیا ہے ، خصوصاً ترقی یافتہ اور خوش حال ممالک میں کچھ عرصہ پہلے تک لوگ شادی کرنے کے ساتھ ساتھ اسے نباہنا بھی ایک خوش گوار اور ضروری فریضہ سمجھتے تھے ، لیکن اب ایسے لوگوں کی تعداد امریکا اور یورپ ہی میں نہیں بلکہ مشرقی ممالک میں بھی بڑھ رہی ہے جو روایتی شادی ، اس کی پابندیوں اور مطالبوں کو پورا کرنے سے گریزاں ہیں ۔ انسانی تواریخ میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی جب شادی کے ادارہ کو اپنی بقا کے لئے اتنے چیلنج اور بحران کا سامنا کرنا پڑا ہو جیسا کہ اب خصوصاً ترقی یافتہ ممالک اور معاشروں میں ہو رہا ہے ۔ شکاگو یونی ورسٹی کے ماہر سماجیات اپنی کتاب "A TREATISE ON THE FAMILY" میں رقم طراز ہیں :

" پچھلے چند سالوں میں خاندان کے تصور میں جو تبدیلی آئی ہے ، وہ پہلے کبھی نہ آئی تھی ۔ "

آکسفورڈ یونی ورسٹی کے ڈیوڈ کول مین کہتے ہیں :

" ۱۹ ویں صدی یا شاید اس سے بھی پہلے سے خاندانی ادارہ کو ایسے منفی بلکہ پارہ پارہ کر دینے والے رجحانات اور اقدام کا سامنا نہیں ہوا تھا ۔ "

چنانچہ خاندانی زندگی کی شیرازہ بندی کے نقطہ نظر سے شادی کا ادارہ ایسے زبردست بحران سے دوچار ہے جس کے نتیجہ میں کم و بیش سارے روایتی ضابطے دم توڑ رہے ہیں اور انسان بنیادی سماجی تنظیم کے بغیر کسی انجانی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہے ۔ شادی کے ادارہ میں جو دھماکا برپا ہو رہا ہے ، اس کی ہلاکت خیزی کا پوری طرح ادراک و احساس نہ پرانی نسل کو ہے نہ نئی نسل کو ۔ مختلف مقامات

میں شہروں اور دیہاتوں میں شادی اور طلاق کو متاثر کرنے والے اسباب مختلف ہوتے ہیں ، اس لئے معاشرتی دھماکے کے اثرات اور مضمرات کی نوعیت بھی ہر علاقہ اور معاشرتی گروپ پر یکساں نہیں ہے ۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ایک حالیہ سروے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ سفید فاموں کی نسبتاً سیاہ فام طبقہ میں شادی کا تناسب زیادہ تیزی سے گھٹ رہا ہے ۔ دوسرے یہ کہ دیہی علاقوں کی نسبتاً شہری علاقوں میں ضیاع حمل کا تناسب تقریباً دگنا ہے ۔ اسی طرح طلاق کا تناسب بھی بعض ریاستوں میں دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے ۔

شادی سے متعلق تصورات میں جو بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں ، ان کا لازمی نتیجہ طلاق کی شرح میں بعید از قیاس اضافہ ہے ۔ گذشتہ چند برسوں میں امریکا میں طلاق کی شرح تین گنا ہو گئی ہے ۔ اس دھماکا خیزی کا دوسرا اثر یہ ہے کہ شادی کے بغیر جنسی تعلقات کو سماج میں روز افزوں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور اگر یہی رجحان برقرار رہا تو طلاق اور غیر شادی شدہ والدین کے چند برسوں کے اندر ہی اٹھارہ سال کی عمر پہنچنے تک والے ۷۰ فی صد بچے " واحد والدین " کی سرپرستی میں پرورش پائیں گے ۔

پھر بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آج کے سماجی اور اخلاقی حیثیت سے تخریبی دور میں بھی روایتی پائدار شادی اور خاندان خاصی تعداد میں ملتے ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ پچھلے چند برسوں سے جن اقدار کو زندگی سے نکال پھینکنے کو فرد کے حقوق کی لازمی کڑی سمجھا جانے لگا تھا ، اب اس عمل میں کچھ ٹھہراؤ سا نظر آتا ہے ، چنانچہ ایک مطالعہ کے مطابق امریکا میں طلاق کی شرح میں اضافہ کی رفتار کچھ کم ہو چلی ہے ۔ ساتھ ہی غیر شادی شدہ جوڑوں کی تعداد بھی بڑھتی نظر نہیں آتی ۔ اب تو اخباروں اور رسالوں میں بھی ایسے مضامین کی اشاعت بڑھ رہی ہے جن میں شادی اور فیملی کے روایتی اقدار کو اجاگر کر کے انسانی مفاد میں ان کی برتری ثابت کرنے

کی کوشش کی جاتی ہے ۔ سوچ کی یہ راہ یورپ میں بھی ابھر رہی ہے اور اب اکثر لوگ یہ ریسرچ کرتے پائے جاتے ہیں کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو طویل عرصہ تک یا تاحیات شادی کے بندھن کو مضبوط رکھتے ہیں ، چنانچہ اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ ہر شادی شدہ جوڑے کی زندگی میں کبھی کبھی نشیب و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں ، لیکن پائدار ازدواجی زندگی میں جو طمانیت ، تحفظ اور رفاقت کا احساس ملتا ہے ، اسے حاصل کرنے کی خاطر اختلافات پر فتح حاصل کرنا لازمی ہے ۔ ایک امریکن خاتون MRS. KERSON کا کہنا ہے اور ان کے الفاظ جدید ابھرتے ہوئے رجحان کی خاصی عکاسی کرتے ہیں :

"شادی شدہ زندگی میں مسائل تو پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن اگر کوشش کی جائے تو انہیں حل کر کے شادی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے ۔ گو اکثر ازدواجی زندگی کو مستحکم بنیادوں پر قائم رکھنا خاصا کٹھن ہوتا ہے ، لیکن دونوں فریقوں اور خاص طور پر بچوں کے مفاد کا یہی تقاضا ہے ۔"

"MARRIED PEOPLE STAYING TOGATHER IN THE AGE OF DIVORCE"

کی مصنفہ FRANCIVE کو یقین ہے کہ شادی کا ادارہ جلد ہی موجودہ بحران پر قابو پالے گا ۔ اپنی کتاب میں وہ لکھتی ہیں :

"مجھے ایسے لاتعداد لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو حقیقتاً اپنی ازدواجی زندگی سے بہت خوش تھے اور پائدار ازدواجی زندگی کی مانگ بڑھ رہی ہے ۔"

بہرحال ۲۰۰۱ء تک شادی اور فیملی کس حد تک اپنی موجودہ شکل و صورت میں باقی رہیں گے۔ اس سلسلہ میں متضاد رائیں اور قیاس آرائیاں ہیں۔

JERRIE TURBERG جو نیویارک میں MARRIAGE THERAPIST ہے، طلاق کو ایک وبا سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس بات کی بہت کم گنجائش ہے کہ موجودہ بحران پائدار شادیوں تک رہنمائی کر سکے گا۔ اس کے برخلاف کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ طلاق کے بعد زیادہ تر لوگ چونکہ پھر شادی کر لیتے ہیں، اس لئے شادی کی افادیت کا احساس لوگوں کو اب بھی ہے۔

* REFERENCES:

1 - FREDRICLE PAY

2 - MC . LENNEN

3 - ROBERTSON SMITH

4 - MORGAN

# میری ڈائری کے کچھ اقتباسات

کناڈا میں بائیں بازو اور تحریک نسواں سے منسلک ایک جرنلسٹ خاتون سے کچھ عرصہ پیشتر کمیونسٹ پارٹی کے ایک جلسہ میں ملاقات اور تعارف ہوا۔ وہ انہی دنوں گنی بساؤ کے دورہ سے واپس آئی تھیں۔ ان سے باتیں کر کے ہماری معلومات میں مثبت اضافہ ہوا۔ گنی بساؤ مغربی افریقہ میں پرتگالی نوآبادیات تھا اور غالباً ۱۹۷۴ء میں کامیاب انقلابی (بائیں بازو کی) جدوجہد کے بعد پبلک آف گنی بساؤ کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ ملک تو چھوٹا سا ہے، لیکن نوآبادیاتی چنگل سے رہا ہونے کے بعد امید ہے کہ انقلابی حکومت کے طفیل جلد ہی بساط عالم پر ممتاز اور اہم حیثیت حاصل کر لے گا۔

اس نئی انقلابی حکومت میں عورتوں کی آزادی اور نجات کو فرائض ریاست میں کلیدی حیثیت دی جارہی ہے۔ حکومت کی انتھک کوشش ہے کہ ملک کی سماجی سیاسی اور معاشی زندگی میں مرد و عورت دونوں کی ہر لحاظ سے مساوی درجہ کو عملی طور پر یقینی بنایا جائے۔ گنی بساؤ رقبہ کے لحاظ سے انتہائی چھوٹا، آمدنی کے حساب سے غریب ترین اور ترقی کے لحاظ سے پس ماندہ ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایسے ملک میں عورتوں کی تحریک آزادی کیسے جنم لے سکتی ہے اور عملی جامہ پہننے کی جانب بڑھ سکتی ہے، اس کا مطالعہ بہت دل چسپ، معلوماتی اور کارآمد بھی ہے۔ اپنی جرنلسٹ شناسا کی زبانی ساری باتیں سن کر دل تو بے حد مچلتا رہا کہ کانوں سنے ان حقائق کا آنکھوں دیکھا مشاہدہ کر سکتے، مگر وہ جو کسی نے کہا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

تو اسی مصرع کو دہرا دہرا کر دل کو بہلا لیا۔

گنی بساؤ میں اب تک سرمایہ دارانہ نظام نے جڑ نہیں پکڑی ہے ۔ اس کے باوجود تیسری دنیا میں یہ ایک انقلابی سماج کی بنیاد رکھنے کی راہ پر رواں دواں ہے ، لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ گنی بساؤ کی انقلابی حکومت اور انقلابی عوام کو اس بات کا بخوبی شعور ہے کہ سماجی انقلاب بتدریج اور مرحلہ وار ہی ممکن ہے ۔ انقلابی قانون بنا دینا کوئی مشکل نہیں ہے ، لیکن قانون تو تبدیلی میں صرف معاون ہو سکتا ہے ۔ اصل دشواری عقائد اور جڑ پکڑے ہوئے رسم و رواج کو بدلنے میں ہوتی ہے ۔ انقلاب کے وقت گنی بساؤ کی عورتیں تین زبردست سماجی ناانصافیوں کا شکار تھیں : ۱ زبردستی کی شادی ۲ ۔ انہیں طلاق کا حق نہ ہونا اور ۳ ۔ تعدد ازدواج ۔ انقلاب کے فوراً بعد انقلابی جماعت نے رسوم و رواج کی افادیت یا مضرت رساں اثرات کا از سر نو جائزہ لینا شروع کیا تاکہ ان کی بیخ کنی کی جا سکے ، لیکن ساتھ ہی یہ اس بات پر بھی مصر رہی کہ سارے مضرت رساں اور غیر منصفانہ روایات کے خلاف پہلے اور بتدریج عوام کا شعور ان کے خلاف بیدار کیا جائے ، کیونکہ انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ عوام کی جڑوں کے اندر راسخ کلچر کو صرف انقلابی قانوں کی مدد سے نہ صرف یہ کہ ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ معاشرتی بنیادوں کو بغیر متبادل کلچر ، افادیت کا احساس پیدا کئے بغیر اور عوام کی نفسیاتی حمایت حاصل کئے بغیر ختم کر دینا انقلاب کے حق میں نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے ۔ تحریک آزادی نسواں اور ثمرات انقلاب کی بنیادوں کو استوار بنانے کے لئے عوامی کلچر کے مکمل علم کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کے تہذیبی اور روایاتی اقدار کے مثبت اور منفی ، ترقی پسندانہ اور رجعت پرستانہ ، اور ان خوبیوں اور خامیوں کے لازمی اور ضمنی ، دونوں پہلوؤں کا گہرا جائزہ لے کر عوام میں شعوری طور پر یہ احساس اجاگر کیا جائے کہ ان کے رسم و

رواج اور روایات کا کون سا پہلو عورت اور انسانیت کے لئے باعث ننگ ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ کوئی بھی رسم و رواج، خواہ ان کے اثرات کتنے ہی منفی کیوں نہ ہوں، یک دم انہیں انقلابی ذرائع سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ گنی بساؤ کی انقلابی حکومت کے رہنما اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جبری شادی اور تعدد ازدواج کا خاتمہ، طلاق کا حق وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کا حل ضروری ہے اور جو عورتوں کی آزادی کے اہم ستون ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ صرف قانون بنا دینے سے ان لعنتوں کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان برائیوں کی سرپرستی میں رسم و رواج کے علاوہ سماج کی معروضی ضرورتوں کا بھی ہاتھ رہا ہے اور اسی لئے قانون سے زیادہ پیداواری رشتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے نقطہ نظر اور انسانی اقدار کے معیار میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

بہرحال باوجود ان سب باتوں کے یہ حقیقت ہے کہ گنی بساؤ میں مکمل انقلاب کی ایک میں واضح اور لازمی شرط یہ ہے کہ عورت صحیح معنوں میں آزاد اور "پوری انسان" ہو۔ ساتھ ہی یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ عورت کی آزادی کی جدوجہد ایک طویل جنگ سمجھی جاتی ہے جس کی قیادت خود عورت کو کرنی ہے، چنانچہ گنی بساؤ کے خود مختار ہونے کے باوجود چونکہ قوم آزاد ہے، اس لئے لامحالہ عورتیں بھی آزاد اور نجات شدہ ہو جائیں گی، یہ محض غلط فہمی ہو سکتی ہے حقیقت نہیں۔ نظریہ کو کس طرح عمل کے روپ میں ڈھالا جائے کہ یہ عورت اور مرد دونوں کے لئے انقلابی حقیقت بن سکے اور کس طرح عورتوں نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے، یہ گنی بساؤ کے خصوصی حالات سے کافی حد تک واضح ہو چکا ہے۔ گنی بساؤ کی عورتوں کی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں سے ہر ملک کی عورتیں سبق لے سکتی ہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ مکمل انقلابی مرحلہ کی تکمیل کے بغیر عورتوں کے لئے حقیقی

آزادی کا حصول تقریباً ناممکن ہے۔

گنی بساؤ کا رقبہ بہت کم ہے، یعنی تقریباً ۱۴ ہزار میل۔ اس کے باوجود افریقہ کی تاریخ اور سیاست ایک نئے رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کی وجہ اس کی جنگ آزادی کی خصوصی نوعیت ہے۔ افریقہ کے ممالک میں پہلی بار گوریلا طریقہ سے ایک نوآبادیاتی طاقت کو ملک سے ہٹانا مقصود نہ تھا بلکہ ایک نئے غیر استحصالی سماج کو وجود میں لانا تھا۔ گنی بساؤ کی انقلابی تحریک اس بات پر شدت سے زور دیتی رہی ہے کہ عورتیں جب تک سیاسی، معاشی اور سماجی حیثیت سے جدوجہد اور نئے سماج کی تعمیر میں مساوی اور مثبت کردار ادا نہیں کرتیں، انقلاب مکمل نہیں ہو سکتا۔ عورتوں کو دو نوآبادیاتی نظام سے نبرد آزما ہونا ہے۔ ایک تو پرتگالیوں کی سیاسی اور دوسرے مردوں اور روایات کی بالادستی سے۔ کم و بیش اسی صورت حال کا مقابلہ عورت کو دنیا کے ہر ملک میں کرنا ہے جہاں براہ راست نوآبادیات سے واسطہ نہیں ہے، وہاں سرمایہ داری، جاگیرداری اور امپیریلزم موجود ہے۔ جدوجہد کے ذریعہ اس نوعیت کی لوٹ کھسوٹ کو سیاست اور معیشت میں ختم کر دیا جاتا ہے، مگر عورتوں کا استحصال جس کی بنیاد کبھی سیاست اور معیشت رہی ہو لیکن آج روایات، رسم و رواج عورتوں کے سامنے زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ روایات، صدیوں پرانے رہن سہن اور دونوں جنسوں کے آپس کے تعلقات بڑی مشکل سے تبدیل ہوتے ہیں اور اکثر غیر استحصالی نقطہ نظر رکھنے والے افراد بھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس رویہ سے چھٹکارا نہیں پا سکتے اور ان تصورات کے خلاف عمل کرنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر ایک وجہ اور بھی ہے کہ سیاسی اور معاشی نظام میں برابر انقلاب آتا رہا ہے۔ کسی ایک نظام یا نظریہ کی جڑیں انسان کی نفسیات اور زندگی میں اتنی راسخ نہیں ہو پاتیں کہ انہیں فطرت کا تقاضا سمجھ لیا جائے۔ بہتلا غلام سماج کے

بعد جب جاگیرداری نظام نے اپنی جگہ بنائی تو دونوں نظاموں کے حامیوں میں اختلافات کے باوجود کسی بھی فریق کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ غلام سماج عین تقاضائے فطرت ہے۔ جو بھی اختلاف یا تنازعہ ہوا، وہ ذاتی یا طبقہ وارانہ مفاد کی بنا پر تھا۔ اسی طرح جب سرمایہ دارانہ نظام نے جاگیردارانہ نظام کی جگہ لی تو یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ سرمایہ دار طبقہ کو مزدور اپنی نئی حیثیت سے مطلوب تھا۔

جب ہم گنی بساؤ کے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں تو عورتوں کی محکومیت اور پس ماندگی کے پس پشت بظاہر تو معاشی محرکات بھی نظر نہیں آتے کہ یہ ملک جہاں کی معیشت تقریباً مکمل طور پر زرعی ہے، وہاں کھیتی باڑی کا اہم کام عورتوں کی ذمہ داری رہی ہے، لیکن وہاں بھی باپ اپنی بیٹیوں کو بیچتے رہے ہیں اور مرد کئی کئی بیویاں رکھتے ہیں جیسے کسی زمانہ میں کئی کئی غلام کھیتی باڑی کا کام کرنے کے لئے رکھے جاتے تھے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ آخر جب عورتیں معاشی طور پر پیداوار میں اتنا اہم حصہ لیتی ہیں کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گنی بساؤ میں مرد ان کی کمائی کھاتے ہیں تو پھر وہاں مردوں کی حاکیت کیوں ہے۔ عورتوں کی محکومیت انقلاب کے ذریعہ نہیں بلکہ آہستہ آہستہ بتدریج نئے زاویہ نظر کو رائج کرکے ختم کر رہے ہیں۔ یہ احساس تو انہیں پوری طرح ہے کہ تہذیبی انقلاب عورتوں کی نجات کے لئے بہت ضروری ہے اگرچہ یہ انقلاب غیر انقلابی طریقہ کار کے ذریعہ ہی آسکتا ہے۔ گنی بساؤ کی عورتیں اپنی مشکلات، مسائل اور مطالبوں کا خود تعین کرتی ہیں۔ وہ یہ امید نہیں رکھتی ہیں کہ حکومت یا کمیونسٹ پارٹی کی قیادت، جن کی اکثریت مرد اشخاص پر مشتمل ہوتی ہے، ان کے لئے یہ کام کر دے گی۔ کمیونسٹ پارٹی نے ابتدا ہی میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ عورتوں کو ان کی نجات تحفہ کے طور پر کمیونسٹ حکومت کی طرف سے نہیں ملے گی۔ بے شک یہ ان کا حق ہے، مگر حق چھیننا ہوتا ہے خواہ غاصب کوئی بھی

ہو، چنانچہ وہاں عورتیں اپنی مشکلات کا جائزہ لے کر ان کے حل کے لئے مطالبات پیش کرتی ہیں ۔ قانون ان کی ہم نوائی کرتا ہے، لیکن قانون کو باثر بنانے کے لئے انقلابی شعور لازمی ہے ۔

کسان عورتوں کی حالت سدھارنے کی کوشش انقلابی حکومت کے ساتھ خود عورتیں بھی کر رہی ہیں ۔ وہ اس اطمینان میں نہیں ہیں کہ ہم نے نوآبادیاتی نظام کی جنگ میں مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لیا ہے تو معاشرہ میں ہمیں منصفانہ مقام آپ سے آپ مل جائے گا ۔ تقریباً ۹۵ فی صد عورتیں زمینی پیداوار سے وابستہ ہیں ۔ اپنی پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانے کا شعور بڑھ چلا ہے ۔

کسان عورتوں کی سماجی حیثیت بلند کرنے کی کافی کوششیں ہو رہی ہیں وہاں تقریباً ۹۵ فی صد عورتیں چونکہ زمینی پیداوار سے وابستہ ہیں اس لئے ان میں اپنی پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانے کا جذبہ روزافزوں ترقی پر ہے اور ہر آنے والے روز کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔ زیادہ سے زیادہ لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے کی طرف رجوع ہو رہی ہیں ۔ اور ظاہر ہے لڑکیاں انقلابی شعور کے ساتھ جتنا زیادہ تعلیم حاصل کریں گی، نئی نسل کو اپنی آزادی کے حصول کی اتنی ہی زیادہ لگن پیدا ہو گی اور عوام کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گی ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی سچ ہے کہ عورتوں کی حقیقی آزادی کا اگلا قدم گنی بساؤ میں تبھی اٹھ سکتا ہے جب پیداواری بوجھ میں مرد و عورت برابر کے ساجھی ہوں اور مرد صرف عوتوں کا ہاتھ نہ بٹائیں ۔

یہاں مزے کی بات یہ ہے کہ گنی بساؤ میں عورت روز مرہ کی روٹی کمانے میں مردوں کا صرف ہاتھ نہیں بٹاتی بلکہ خاندان کی روٹی مہیا کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے ۔ مرد البتہ صرف اس کا ہاتھ بٹا دیتے ہیں ۔ لیکن عورت پھر بھی مردوں کے مساوی حقوق کی مالک نہیں ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ مرد عورتوں کے جتنا کام کر

کے کچھ اس کا بوجھ ہلکا کریں۔ دوسرے ممالک میں صورت حال بالکل الٹ ہے۔ چونکہ روٹی مہیا کرنے کی بنیادی ذمہ داری مرد کی ہے، اس لئے عورت ہزار کام کرے اسے سماج میں وہ مرتبہ نہیں ملتا جو مرد کو ملتا ہے، چنانچہ ہمارا رونا اور مطالبہ یہ ہے کہ عورتوں کو معاشی زندگی میں کلیدی کردار ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوال الجھاوے میں ڈالتا ہے کہ اگر مادی ضروریات کی فراہمی کی بنا پر عورت پر مرد کی حاکمیت کا آغاز ہوا ہوگا تو پھر گنی بساؤ میں عورت کیوں محکوم ہے۔ زبردستی کی شادی عورت کو طلاق کا حق نہ ہونا اور مرد کا بیک وقت کئی کئی بیویاں رکھنا، یہ سب عورت کے ساتھ ناانصافی ہے لیکن گنی بساؤ کے سماج کی بنیاد ہی ان سماجی ناہمواریوں پر ہے۔ تاویل اس سماجی ناہمواری کی یہ ہے کہ یہ زراعتی ملک ہے۔ کھیتی باڑی کا کام کرنے والوں میں عورتوں کی اکثریت ہے۔ ان کے فرائض اور حقوق سے متعلق رسم و رواج، سماجی دستور اور روایات گاؤں کی معاشی اور پیداواری ضروریات سے منسلک ہیں۔ لڑکی کے باپ کو اس کا شوہر اس کی قیمت ادا کرتا ہے۔ اب اگر بیوی کو طلاق کا حق حاصل ہو تو ایسی صورت میں سارے خاندان کا معاشی نظام درہم برہم ہو جائے گا تاہم اگر عورت بھاگ جائے تو بچہ اس کے شوہر کی ملکیت ہوتا ہے۔ اگر بچہ نہ ہو تو پھر مرد کو لڑکی کے باپ کی طرف سے وہ قیمت واپس مل جاتی ہے جو اس نے ادا کی ہوتی ہے۔

ان رواجوں نے نہ صرف کام کرنے والوں اور ان کی اگلی نسل کو تیار کرنے میں مدد دی بلکہ گاؤں کی زندگی میں ان کی وجہ سے سماجی تحفظ بھی ملتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک مرد کے کئی بیویاں رکھنے کی وجہ سے گھریلو زندگی میں عورتوں میں مشترکہ ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ ایک عورت بیمار پڑے تو دوسری عورت اس کی دیکھ بھال کر لیتی تھی۔ جب بچوں کی مائیں مرجاتی تھیں تو ان کی نگہداشت شوہر کی

دوسری بیویوں یا اس کے رشتہ داروں کے سپرد ہوتی تھی ۔ فصلی کے زمانہ میں ساری بیویاں مل کر کام کرتی ہیں ۔یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر خصوصی نظام کام کر رہا تھا ، چنانچہ معاشرہ کے اس ڈھانچے کو یکایک بدل دینا مشکل اور ایک معنوں میں تخریبی کارروائی ہوتی کہ سارا معاشی ڈھانچا تہ و بالا ہو کر رہ جاتا کیونکہ یہ طریقہ کار اگر ایک طرف عورتوں پر بہت بوجھ ڈالتا ہے اور ان کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کرتا ہے تو دوسری طرف اہم معاشی نظام کا سنگ بنیاد بھی ہے ۔

اگرچہ PAIG ان استحصالی رسوم کے خلاف ہے اور انہیں عورتوں کے خلاف کھلی جارحیت تصور کرتی ہے ، پھر بھی اس نے ان رسوم کو غیر قانونی قرار نہیں دیا ۔ اس کے برخلاف سیاسی تربیت کا سلسلہ شروع کیا گیا کہ مکمل سیاسی تبدیلی نقطہ نظر میں لائی جا سکے ۔ ان کے نزدیک یہی واحد ذریعہ سماجی برائیوں کو دور کرنے کا ہے "ہمیں آگے بڑھنا ہے ، مگر آہستہ آہستہ کہ عوام ہمارے خلاف نہ ہو جائیں ۔" معاشی ڈھانچا ، جو معاشرہ کا SUB-STRUCTURE ہوتا ہے ، اسے انقلاب کے ذریعہ تبدیل کیا جا سکتا ہے اور یعنی پیداواری رشتوں اور طبقات میں انقلاب ، لیکن SUB-STRUCTURE میں انقلاب اور SUPER STRUCTURE معاون تو ہوتا ہے مگر یہ انقلاب کا لازمی نتیجہ کبھی نہیں ہوتا ۔ یہ ایک علیحدہ قسم کا نوآبادیاتی نظام ہے جس میں مقابلہ باہر کے حکمرانوں سے نہیں بلکہ ان سے ہوتا ہے جن سے ہم پیار کرتے ہیں ، یعنی مرد جو ہمارا باپ ، بھائی ، بیٹا اور محبوب ہوتا ہے ۔

مردوں کے لئے آزاد شدہ گنی بساؤ میں صورت حال بالکل دوسری تھی ۔ عورتوں میں نئے ابھرتے ہوئے سیاسی اور معاشرتی شعور سے ان کا خیال تھا کہ انہیں نقصان تو بہت ہو سکتا تھا ، لیکن فائدہ کی امید کم تھی ۔ ایک کسان بچہ اپنے ارد گرد جو ماحول دیکھتا تھا ، وہی کچھ بننے کی اس کی آرزو ہوتی تھی ۔ کئی ایک بیویوں پر

حکومت کر کے اسے جو اعلیٰ سماجی مرتبہ اور وقار حاصل ہو سکتا تھا وہ ایک مساوی حیثیت کی شریک زندگی سے ملنے کی امید وہ نہیں کر سکتا تھا۔ گاؤں کی موجود معاشی تنظیم سے اسے ایک اور ممتاز حیثیت حاصل ہونے کی امید ہوتی تھی، اس لئے وہ اس کی حمایت کرتا تھا۔ اب عورتوں کے فیصلہ کرنے کی بات تھی کہ مرد کا مرتبہ اس نظام میں جتنا بلند ہو گا، عورت کی حیثیت اتنی ہی پست ہو گی ۔ مرد کے بغیر زندگی گذارنے کا تصور ہی مصنوعی ہے، اس لئے اس نوآبادیات سے ٹکر لیتے وقت عورتوں کو پرتگالیوں کی مانند دشمن سے ملک کو آزاد کرا کے ملک کی سرزمین کو جیتنا نہیں تھا بلکہ مردوں کے ذہنوں کے خلاف انقلاب لا کر خود مردوں کو جیتنا تھا۔

PAIG نے جو سیاسی تنظیم نو شروع کی، اس سے شروع میں لوگ انہیں وجوہ سے خائف تھے۔ PAIG نے جو تحریک نوآبادیات کو ختم کرنے کے لئے شروع کی تھی وہ پرانے سماجی ڈھانچا کے خلاف چل پڑی ۔ اگرچہ اس کی قیادت عورتوں کے ہاتھوں میں تھی، لیکن آہستہ آہستہ انہیں بھی احساس ہو چلا کہ قدیم سماجی ڈھانچے کی بنیاد ناانصافی اور دوسری جنس کے استحصال پر ہے اور اسے برقرار رکھنا نہ مردوں کے مفاد میں ہے نہ عورتوں کے ۔ عام طرز زندگی کا معمول کچھ دنوں کے لئے تو ضرور ایک حد تک افراتفری کا شکار ہوا، لیکن جلد ہی نئے نظام زندگی نے اس پر قابو پا لیا۔ PAIG نے عورتوں کے ساتھ پورا تعاون کیا ۔ شروع میں جو تبدیلیاں لائی گئیں، وہ ڈرامیٹک تو بے شک تھیں لیکن ان کے اثرات محض ابتدائی تھے ۔ انقلاب کے ابتدائی ادوار ہی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ انقلابی نصب العین کے باوجود SUPER STRUCTURE پر شعوری طور پر ضرب نہ لگائی جائے کہ عورتوں کی نجات کی راہ آپ سے آپ ہموار نہیں ہو سکتی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رہن سہن، رسم ورواج، طور طریقوں، سماجی تعلقات یعنی بحیثیت مجموعی کسی معاشرہ کے تہذیبی

روپ رنگ کا دارومدار بے شک طریقہ پیداوار اور پیداواری رشتوں سے متعین ہوتا ہے، لیکن عقائد اور رسم و رواج کی جڑیں اتنی گہری پیوست ہو جاتی ہیں کہ محض طریقہ پیداوار اور پیداواری رشتوں کو تبدیل کرنے ہی سے تہذیب اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہیں ڈھالتی تاوقتیکہ دوسرا کلچرل انقلاب برپا کیا جائے اور اس کے لئے معروضی حالات کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ذہنوں کو بھی بدلنا پڑتا ہے، چنانچہ عورتوں کی جمہوری انجمن بڑی حد تک غیر موثر ثابت ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ انقلاب کے ہر دو پہلوؤں سے صحیح طور پر نمٹ نہ سکی، اس لئے کہ انقلابی تحریک میں حصہ لینے والی خواتین اس غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار تھیں کہ انقلاب کے کامیاب ہوتے ہی انہیں دوسرے نوآبادیاتی استعمار سے بھی آپ سے آپ نجات مل جائے گی۔ دوسرے یہ کہ اس جمہوری یونین میں امرا کے طبقہ کی عورتوں کا خاصا اثر و رسوخ تھا جنہیں عورتوں کی نجات سے زیادہ اپنے ذاتی مرتبہ کا خیال تھا اور جو اپنی بلند و بالا حیثیت سے نیچے اتر کر انقلابی رہنما بننے کے لئے تیار نہ تھیں۔ اس لئے بجائے اس کے کہ اس طرح کی رجعت پرست تنظیم سے سمجھوتا کر کے عورتوں کی انقلابی تحریک کو سبوتاژ کیا جائے، گنی بساؤ کی بائیں بازو کی جماعت PAIG نے یہ مناسب سمجھا کہ عورتوں کے لئے ایک حقیقت پسندانہ انقلابی ذہن رکھنے والی قیادت کو ابھرنے کا موقع مہیا کیا جائے، چنانچہ مسلح انقلابی جدوجہد کے دوران ہی یہ قیادت ابھر کر سامنے آچکی تھی اور عوام کے درمیان کام کرنے کی وجہ سے ان کی نفسیات اور ان کے مسائل سے عملی طور پر واقف تھی۔ اس قیادت نے یہ سبق بھی اچھی طرح سیکھ لیا تھا کہ پرتگالی سامراج سے ملک کو آزاد کرانے کے بعد انہیں کن خطوط پر سماج میں جنس کی بنیاد پر مروجہ استحصال سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہ اس قیادت کے پاس نظریہ اور عمل میں ہم آہنگی تھی۔

عورتوں کے مختلف کمیشن قائم ہیں جن کے اراکین اپنے اپنے علاقوں کا باقاعدہ دورہ کر کے عورتوں کے سیاسی اور سماجی شعور کو تربیت دیتے ہیں اور انہیں یہ بتاتے ہیں کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اندرونی دشمن ، یعنی سماجی ناانصافیوں ، کے خلاف عورتوں کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہے۔ اسے ہم " انقلاب مسلسل " کہہ سکتے ہیں۔ اسی سے صحیح معنوں میں قوم کی تعمیر نو منصفانہ اور غیر استحصالی بنیادوں پر ہو سکتی ہے ورنہ SUB-STRUCTURE کا انقلاب بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

اس سلسلہ میں کچھ عملی مشکلات کا بھی گنی بساؤ کی انقلابی عورتوں کو سامنا کرنا پڑا۔ حصول آزادی کے بعد بہت ساری رہنما خواتین ایسی تھیں جو مردوں سے زیادہ انقلابی سوجھ بوجھ اور ذمہ داری رکھتی تھیں۔ انہیں اپنی دوسری ذمہ داری ، یعنی دوسری نوآبادیاتی جنگ کے ناگزیر ہونے کا مردوں سے زیادہ احساس تھا۔ ایک دفعہ عورتوں میں شعور پیدا ہو جائے تو وہ اپنے نصب العین کے حصول میں بہت آگے بے خطر نکل جاتی ہیں ، لیکن یہاں مشکل یہ پیش آئی کہ عورتوں کو اس خصوصی جنگ کے لئے عورت رہنماؤں کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ پرتگالیوں سے جنگ میں عورتوں اور مردوں ، دونوں کا مساوی انہماک تھا لیکن اس دوسری جنگ کے لئے انقلابی مرد بھی صحیح شعور نہیں رکھتے تھے اس کی اہمیت کا انہیں شدت سے احساس تھا عورتوں کے کمیشن میں زیادہ تر وہ عورتیں تھیں جنہوں نے پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا تھا۔ اب وہ اہم سیاسی شخصیتیں بن کر سامنے آئیں اور اب ان کے پاس عورتوں کے انقلاب کے لئے پوری دل جمعی سے کام کرنے کے لئے وقت نہ تھا

# شکم مادر کرایہ پر

برصغیر کی تقسیم کا نعرہ جب لگایا گیا میں اسکول کی طالبہ تھی ۔ جب اس نعرہ نے عملی جامعہ پہنا میں ذمہ دار شہری اور ووٹر کی فہرست میں شامل ہو چکی تھی ، لیکن بحالت مجبوری بدلی ہوئی حقیقت کو تسلیم کر لینا تو خیر علیحدہ بات ہے مگر عقل اور جذبات کسی بھی حیثیت سے اس تقسیم کو میں نے نہیں سراہا ۔ بھلا مادر وطن کی تقسیم کیسے ہو سکتی ہے! اس کی کوکھ سے جنم نہ لیا ہو ، اس کی مٹی سے تو جنم لیا ہے ، لیکن تب یہ اندازہ کہاں تھا کہ زمین و زبان کی بانٹ کے بعد سائنس کی کرشمہ سازیاں سچ مچ کی ماں کو بھی بانٹ کر رکھ دیں گی ۔ زندگی کی ساری تکلفیں سارے دکھ درد ایک ماں کا وجود دھو ڈالتا ہے ۔ ماں جو ایثار و قربانی کا پیکر سمجھی جاتی رہی ہے ہر دور ، ملک اور مذہب میں ماں اور بچہ میں خون کا ، روح کا اور تخلیق کا رشتہ ہوتا ہے مگر ہائے رے تحقیق و ریسرچ ! کہ اس اکلوتے رشتہ کے تقدس کو بھی پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے ۔

" کرایہ پر شکم مادر کی ضرورت " کے اشتہار نے جو فلوریڈا سے ایک شخص نے ۸۲ ء میں دیا تھا ، انسانی رشتوں کی ہماری جانی بوجھی دنیا میں تہلکہ اس لئے نہیں مچایا کہ یہ تجارت کا اور منافع کمانے کا دور ہے بلکہ وہ ملا جو افغانستان میں کیمونسٹوں کے ہاتھوں سود خوری کے نظام کو بند کرنے پر اسلام خطرہ میں ہے کہہ کر جہاد کا فتویٰ دیتا ہے ، اسے شکم مادر کرایہ پر ملنے کی شاید خبر بھی نہ ہوتی ۔ بہر حال متذکرہ اشتہار دینے والے شخص کو ایک ایسی عورت کی خدمات درکار تھیں جو بغیر زوجیت کے اس کے بچہ کو جنم دے سکے ۔ نو مہینے بچہ پیٹ میں رکھنے کے عوض دس ہزار ڈالر معاوضہ ۔ کناڈا کی ایک بیس سالہ لڑکی سے معاہدہ طے پا گیا ۔ اشتہاری باپ کے نطفہ سے انجکشن کے ذریعہ لڑکی حاملہ ہوئی اور معینہ مدت کے بعد بچہ ہوا جسے اس کے باپ کے

حوالہ کر دیا گیا۔ جب اخباری نمائندوں نے کرایہ کی ماں سے انٹرویو کیا کہ بچہ کو اتنے دنوں تک پیٹ میں رکھ کر پیدا کرنے کے بعد اسے ایک ان دیکھے شخص کے حوالہ کر دینے پر اس کے کیا جذبات تھے تو اس نے بڑے آسانی سے بتایا،

"میں نے تو اپنا رحم نو ماہ کے لئے بچہ کے باپ کو کرایہ پر دے دیا تھا اور یہ کہ ایسی صورت میں اس کے دل میں مادری جذبات کے جنم لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے اپنے دو بچے ہیں اور میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔" میں آج تک یہ سوچتی ہی رہ گئی کہ ہم لوگ کتنے بے وقوف تھے کہ ماں کی محبت کو اس کمرشل دور میں بھی لازوال اور غیر بکاؤ شے سمجھا کئے۔ ہمارے اس رد عمل کو ترقی یافتہ لوگ رجعت پرستی کہتے ہیں۔ اگر یہ رجعت پرستی ہے تو بے شک مجھے اعتراف ہے۔

## انسان کے تہذیبی ارتقا کی اگلی منزل

پرانی اقدار، روایات اور اخلاقی پابندیاں آج خس و خاشاک کی مانند بہہ رہی ہیں۔ لوگ ان سے چھٹکارا پا رہے ہیں اور اکثر تو ایک ہی جھٹکے میں انہیں توڑے دے رہے ہیں، مگر کیا ساری پرانی اقدار کا یہ سیلابی بہاؤ درست، خوش آئند اور انسانیت کے مستقبل کے لئے امید افزا ہے؟ کیا یہ ہمیں انسانی معاشرے کے انتشار کی جانب نہیں لے جا رہا ہے؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے کرب ناک سوالات ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ پرانی اقدار اور تہذیب کو اجنتا کی نقاشی سے مماثل کرنے سے بات کچھ بنتی نہیں۔ انسانی معاشرہ اور اس کی تہذیب ہزار خامیوں اور ناانصافیوں سے پر ہو، مگر یہ زندہ ہے جامد کبھی بھی نہیں رہی۔ جانے کتنے ہی ان گنت قرنوں اور صدیوں پر محیط یہ اپنی موجودہ شکل میں آئی ہے۔ اس کی ہر اگلی منزل موجودہ منزل سے آگے کی طرف رہی ہے اور رہنا چاہیئے۔ ارتقائی عمل کے ذریعہ

فرسودہ طرز فکر اور طریقہ کار کو تبدیل کر کے سماج کو نئے تمدنی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا زندگی اور زندہ معاشرہ کا مطالبہ ہے۔ لیکن اگر موجودہ تہذیب و اقدار کی ساری بنیادوں کو یکایک ڈھا دیا جائے تو ایک ایسے تاریک تہذیبی خلا سے واسطہ پڑے گا جس کی گہرائی اور اندھیرے پن کی کوئی تھاہ نہ ہوگی اور شاید اگر انسانیت بچ گئی تو نئی تہذیبی عمارت کو ابتدائے آفرینش سے شروع کرنا ہوگا۔

ایک تہذیب ختم اسی وقت ہوتی ہے جب اس کی کوکھ سے ایک نئی تہذیب جنم لے چکی ہوتی ہے۔ پرانی اور نئی اقدار کا آپس میں یہی تعلق ہے جو سمندر کی لہروں کا ایک دوسرے سے ہے۔ یہ اس میں ضم ہوتی ہیں۔ ان کی سمتیں متضاد نہیں ہوتیں۔ یہ کہنا کہ آج ہمارے تہذیبی اقدار اور اخلاقی پابندیاں مردہ ہو چکی ہیں اور نئی تہذیب کی تخلیق خلا سے کرنا ہے، تعمیری اور مثبت طرز فکر نہیں ہے۔ زندگی کے نئے مطالبات اور ان سے پیدا شدہ نئی اور پرانی تہذیبی اقدار ایک دوسرے سے متصادم ہو کر نہیں بلکہ آگے پیچھے چلتی ہیں۔

یہ ہمارے ذاتی خیالات و تاثرات ہیں اور اس سرزمین (شمالی امریکا) پر اظہار خیال کے لئے بچے ہیں جہاں کے لوگوں کی اکثریت نے اقدار و اخلاقیات کی پابندیوں سے مکمل چھٹکارا حاصل کرنے کی ٹھان لی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی فعل کے نیک و بد اور صحیح یا غلط اور اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کا فیصلہ کرنا اجتماعی نہیں بلکہ ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے۔ اس میں دخل اندازی کرنا فرد کی آزادی پر حملہ ہے انسانی معاشرہ میں فرد کی لامحدود آزادی کا یہیں نقطہ نظر آج کل کی اکثریت کا مذہب ہے اور یہی سے کئی قسم کی بدعنوانی اور بے راہ روی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نہ تو عیسائیت کی تلقین ہے نہ کسی اور مذہب کی بلکہ تیزی سے بدلتے مادی حالات کا شاخسانہ ہے۔ فرد کی آزادی کا نعرہ لگانے والوں کا کہنا ہے کہ اخلاقی اقدار کا اجتماعی

درس نہیں دیا جا سکتا۔ ہر فرد کو اس کا فیصلہ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق کرنا ہے کہ اس کے لئے کون سا طرزِ عمل مناسب ہے اور کون سا غیر مناسب۔ دوسرے الفاظ میں تہذیب و اقدار کی روحِ رواں، اخلاقی بندشیں اور اصول، اجتماعی ضابطہ عمل کے دائرہ میں نہیں آتیں بلکہ یہ انفرادی پسند ناپسند پر منحصر ہیں۔ ان کے خیال میں اجتماعی، سماجی ضوابط و قواعد فرد کو پابند سلاسل کر دیتے ہیں، چنانچہ اس نظریہ کے مطابق صحیح اور غلط کا کوئی پیمانہ نہ تو قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ افراد کو ان کے برتنے پر مجبور کرنے کا کوئی جواز معاشرہ کے پاس ہے۔ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اخلاقی معیار کا تعین خود کرے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بحیثیت فرد وہ اپنی انفرادیت رکھتے ہیں اور اخلاقی معیار کا جچا تلا پیمانہ ان کی شخصیت اور انفرادیت کو مسخ کر دے گا۔

کچھ عرصہ پہلے کے مقابلہ میں آج کا معاشرہ زیادہ تر لوگوں کی جانب سے بہت زیادہ دباؤ میں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے سے ہماری مراد ۱۹۵۰ء سے پہلے کا دور ہے۔ لوگ فرد کی آزادی کے جنون میں مبتلا ہو کر ہر پابندی اور اصول سے منحرف ہو رہے ہیں۔ یہ حقیقت ستم ظریفی ہی، مگر اس میں شک نہیں کہ مادی وسائل کی گوناگوں افراط کے باوجود ان کے مسائل کی بے انتہا سنگین ہو گئے ہیں۔ مستقبل پر نظر رکھنے والوں کی لاچاری کا یہ عالم ہے کہ وہ آنے والی ہلاکت خیزی کو محسوس کرتے ہیں اور گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ آج کے مسائل کو حل کرنے کے لئے انفرادیت پرستوں پر نہ تو ماضی کی اقدار کو برتنے کے لئے زور دیا جا سکتا ہے نہ ان پر لاگو کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہر دباؤ اور اصول سے آزاد کر لیا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک مادی اور معاشرتی حالات جس تیزی سے بدلے ہیں، اس کی مثال انسانی تواریخ میں نہیں ملتی۔ آج کی نسل تیزی کے ساتھ رونما ہونے والی مادی، سماجی، معاشرتی اور معاشی

تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے کی دوڑ میں آگے نکل جانے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کے لئے اسے اپنی اخلاقی اقدار اور تہذیبی ورثہ سے بھی ناتا توڑنا پڑے تو پروا نہیں کرتی ۔ایسے ہی حالات کے لئے کسی نے بالکل صحیح کہا ہے:

تھے گو راہ میں کعبہ و دیر بھی
بڑھا ان سے آگے بشر ہی تو ہے

چند قطعی اخلاقی معیار ایسے ہیں جو ، ہر زمانہ ہر مذہب اور ہر ملک میں اب تک تسلیم کئے جاتے رہے ہیں اور جب تک کہ نوخیز ذہنوں کو ان قطعی اقدار کی اہمیت اور افادیت نہ سمجھائی جائے ، انسانیت کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جائے گا ۔ آج ایسا اخلاقی خلا ہے جو ہمیں تباہی کی جانب لے جا رہا ہے ۔ مغربی ممالک میں اس خلا کو پر کرنے کے لئے فرد کی لامحدود آزادی کے سراب کا نعرہ لگایا جا رہا ہے ، مگر اس کے بڑے بھیانک نتائج برآمد ہو رہے ہیں ۔ایک وقت وہ تھا جب ہر شخص کے سامنے نیک و بد کا ایک ہی معیاری تصور ہوا کرتا تھا ۔ لوگ ہمیشہ اس پر عمل نہ کرتے ہوں ، مگر کم از کم وہ یہ جانتے تھے کہ کب وہ صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں ۔ ہمارے بہترین تہذیبی سرمایہ اور اکثر سماجی قوانین کی بنیاد یہی روایتی اور عالمی اقدار ہیں ۔ اخلاقیات کی بنیاد بھی مشترکہ طور پر تسلیم شدہ اعلیٰ اصولوں پر ہوتی تھی جیسے سچائی ، دیانت داری ، محبت ، ہمدردی ، سخاوت ، قربانی ، وفاداری ، عفت و حیا ، شرافت وغیرہ وغیرہ ۔

مغرب میں جنسی انقلاب اور سماجی تعلقات میں انفرادی آزادی کی تند و تیز لہروں نے متذکرہ بالا سارے جذبات اور مقدس اقدار کو پس پشت ڈال دیا ہے ۔ آج کا فرد اپنی کائنات کا آپ مرکز و محور ہے ۔ اس کی ساری سوچ کا نچوڑ یہ ہے کہ اسے وہی کرنا ہے جس میں اسے زیادہ لطف و حظ ملتا ہے ۔ آج ہم ایک ایسے جنگل میں گم

کردہ راہ ہیں جہاں کسی سمت کا تعین ناممکن ہے ۔ جدھر منہ اٹھا چلے گئے اور فرد کو
بھی کیوں دوش دیا جائے ۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جب سائنس انسان کے عالم وجود
میں آنے کا انتظام شیشے کی نلکیوں میں کرے تو پھر آج اگر رسماً یا قانوناً کچھ لحاظ ہے
بھی تو کب تک نکاح بیاہ کا تقدس قائم رہ سکے گا اور جب شکم مادر کرایہ کے لئے خالی
ہو اور معاوضہ کی بنیاد پر ایک شخص ، جو فلوریڈا میں رہتا ہے ، اپنے نطفہ کی اولاد ایک
ایسی عورت کے بطن سے ٹورنٹو میں پیدا کرائے جس کی شکل بھی اس نے کبھی
نہیں دیکھی ہے تو ذہن مفلوج ہو گا یا نہیں ، اخلاقی اقدار کی چولیں ہلیں گی یا نہیں ؟
آج جبکہ ننھے ننھے معصوم بچوں کو ماں باپ کی سرزنش اور سزا سے بچانے کے لئے
مغرب کی فلاحی ریاستوں کی طرف سے ادارے کھلے ہوئے ہیں تو جوان اولاد پر بوڑھے
والدین کا کون سا قرض باقی رہ جاتا ہے جسے چکانے کے لئے وہ ان کی خدمت کو
راحت سمجھیں ۔ آج جبکہ اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کی ساری محرومیوں اور دماغی
الجھنوں کا ذمہ دار معاشرہ اپنی تمام تر پابندیوں کے ساتھ ہے تو وہ سوائے اس کے کیا
کر سکتا ہے کہ انسان سے اپنی نفرت کے شعلہ کو سرد کرنے کے لئے دواؤں میں زہر ملا
کر انہیں اجتماعی طور پر فنا کرنے کے منصوبے بنائے اور یہی آج کی دنیا میں ہو رہا
ہے ۔ قتل و غارت گری ، لوٹ مار ، فتنہ ، جوا ، شادی سے پہلے جنسی تعلقات ........
توبہ ! اگر انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز رکھنا ہے تو پوری شدت اور حاکمیت کے
ساتھ اپنے بچوں کی تربیت ایک تسلیم شدہ اصول اور معیار کے مطابق کرنی ہو گی ۔
" ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی " اور یہ کہ ہمیں کانٹوں سے دامن بچا کر گلاب چننا
ہے اور ضرور چننا ہے ۔ ہم علم و فن اور سائنس کی بہت سی کارآمد جدتیں اور ٹکنالوجی
سیکھ سکتے ہیں ، لیکن جو دولت اور برتری ، اصولوں کی ، اقدار کی کردار و اخلاق اور
تہذیب کی آج بھی بچ گئی ہے ، اسے گنوا اور لٹا کر نہیں بلکہ اسے انسانیت کی معراج

کے ہم نوا بنا کر۔

اپنے معاشرہ کی تباہی کا احساس سنجیدہ حلقوں کو ایک حد تک ہو چلا ہے۔ اب ترقی یافتہ ممالک یہ بات محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کے سماج کو مادی توانائی اور خوش حالی کے ذرائع سے زیادہ آج ذہنی توانائی کے ایندھن کی ضرورت ہے۔

ٹورنٹو یونی ورسٹی کے ایک ماہر سماجیات ڈاکٹر کے خیالات کا اقتباس پڑھئے:

"اس مسئلہ پر تو کسی دو رائے کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ ہمیں پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے افراد کی ضرورت ہے اور وہ معاشرے کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ لیکن جتنی اہمیت سائنس دانوں، ڈاکٹروں، انجینیروں، حساب دانوں، بینکنگ، تجارت اور صنعت و حرفت میں ماہر افراد وغیرہ کی ہے، اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ ضرورت اور اہمیت آج ایسے نوجوان مردوں اور عورتوں کی ہے جو انسانی اقدار و کردار و اخلاقیات کے علوم میں ماہر ہوں۔ میرا مطلب ایسے علوم سے ہے جن کی مدد سے انسان کو اس کی بقا و فلاح کی خاطر انسانیت سکھائی جا سکے۔ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو بامقصد شعر و شاعری، ادب اور فن کی تخلیق کر سکیں، جو سیاسی تصورات اور سماجی مسائل کا مثبت اور تعمیری تجزیہ کر سکیں ایسا تجزیہ جو آج کے گم کردہ راہ فرد کو ایک اعلیٰ مقصد اور ایک نصب العین عطا کرے کیونکہ آج ہمارا معاشرہ ایسے پیشہ ور افراد کا گروہ بن کر رہ گیا ہے جن کا واحد مقصد دولت کما کر عیش کرنا ہے اور جن کی مجموعی آمدنی کو جوڑ کر ہم قومی آمدنی کا حساب لگاتے ہیں۔"

موجودہ معاشرہ کی تیز رفتاری اور اس کے پیچیدہ مسائل کا مطالبہ ہے کہ ایسے تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ افراد ابھر کر سامنے آئیں جو موجودہ نسل کو مستقبل میں پیش آنے والی سماجی خرابیوں اور بیماریوں کی نشاندہی کر سکیں ، جو آنے والے شاک اور دھچکے سے نئی نسل کو بچا سکیں ، جو زندگی کی روز افزوں سہولتوں کو ، جو سائنسی تحقیقات کا عطیہ ہیں ، ایک بامقصد زندگی کے لئے استعمال کرنے کا گر بتا سکیں اور یہ کام سیاست دانوں اور سائنس دانوں کے بس کا نہیں ہے کہ آج کل سیاست دان صرف دعویٰ اور وعدہ گڑھنے کی مشین بن رہ گئے ہیں ۔

## طلاق .... بچوں پر تشدد کی قسم

حالات اور مطالبات زمانہ ، بھلے برے کا معیار اور قابل عمل روایات ہمیشہ یکساں نہیں رہتیں ۔ ویسے بھی انسانی معاشرہ میں تبدیلی زندگی اور ترقی کی علامت اور ضامن ہے ۔ جس معاشرہ یا فرد میں وقت کی رفتار کے ساتھ آگے بڑھنے کا عزم اور صلاحیت نہیں ہوتی ، وہ ختم ہو جاتا ہے ۔ اس سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے یونانی فلسفی نے کہا تھا "CHANGE IS DIVINE ، REST IS EVIL" ، لیکن ہر اٹھنے والا قدم جو راستہ کی دشواریوں سے لاعلم ، نشان منزل سے بے گانہ اور شعوری سوجھ بوجھ سے یکسر محروم ہو ، ترقی کی جانب نہیں لے جاتا ۔ بھلے ہی فرد یا معاشرہ کے حقوق کے سلسلہ میں ایک برائی یا ناانصافی کی بیخ کنی ہو جائے ، لیکن اس ایک کی جگہ بہت سارے دوسرے مسائل ، بے انصافیاں اور حقوق کی پامالی کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ۔

اس وقت میرا موضوع سخن طلاق کی روز افزوں شرح اور اس کے نتیجہ میں معصوم چھوٹے بچوں پر ہونے والی زیادتی اور والدین کے ذریعہ ہونے والے جذباتی

اور ذہنی تشدد کے نتیجہ میں ان کے بنیادی ، ابتدائی اور فطری حقوق کی نفی ہے ۔ بچوں کے ان بنیادی حقوق کی پامالی کے خلاف نہ تو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کی توجہ جاتی ہے ، نہ معاشرہ کی جس کا مستقبل یہ بچے ہوتے ہیں ، نہ والدین کی جن کے جگر کا ٹکڑا اور آنکھوں کے نور یہ نوخیز ہستیاں ہوتی ہیں ۔

ابھی کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ مشرق تو مشرق ، مغربی ممالک میں بھی بلاجواز طلاق کا رواج اور سہولت نہ تھی ۔ اس سے بھی پہلے یہ حالت تھی کہ طلاق کو بہت بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا ، خواہ فریقین کو ایک دوسرے کے ساتھ جہنم کی زندگی کیوں نہ گذارنا پڑے ۔ پھر قانون اور معاشرہ نے اتنی لچک قبول کر لی کہ معقول وجوہات کی بنا پر میاں بیوی طلاق لے سکتے تھے ، لیکن آج طلاق کی طرف رجحان اور اس کی بڑھتی ہوئی سرپٹ مقبولیت نے ہمارے سماج اور نئی نسل کو تباہ کن معاشرتی آتش فشاں کے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ " بنیادی حقوق برائے بالغان " کے داعی یہ کہیں کہ " بلاجواز جب دل چاہے طلاق " لینے میں رکاوٹ فرد کے حقوق کی نفی ہے ۔ بہر حال ایسی رکاوٹ فرد کے حقوق کی نفی ہو یا نہ ہو ، لیکن طلاق لینے اور دینے کی لامحدود آزادی ان بچوں کے بنیادی حقوق کی مکمل اور غیر انسانی نفی ضرور ہے جنھوں نے اپنے والدین سے اس دنیا میں لائے جانے کی درخواست نہ کی تھی اور جن کی نارمل نشوونما اور محفوظ مستقبل کی قیمت ادا کر کے طلاق لینے والے والدین اپنا مستقبل سنوارتے اور اپنے لئے زندگی کی خوشیاں خریدتے ہیں ۔

شروع شروع میں جب یورپ ، شمالی امریکا اور خاص طور پر کناڈا کی زندگی نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا تو یہ سن اور دیکھ کر بے حد طمانیت کا احساس ہوتا تھا کہ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں انسان طلاق لے کر زیادہ خوش گوار اور کامیاب زندگی گذارنے پر قادر ہے جبکہ ہمارے اپنے مشرقی ممالک میں ناکام شادیاں زندگی

بھر کا روگ بن کر رہ جاتی ہیں، چنانچہ اس حسن ظن کے تحت ہم طلاق کے سلسلہ میں حقائق ، وجوہات اور اعداد و شمار جمع کرنے میں جٹ گئے کہ واپس پاکستان جا کر عورتوں کی تحریک آزادی اور حقوق حاصل کرنے کی مہم میں بلاجواز مطالبہ پر طلاق کا حق بھی بنیادی اہمیت کا حامل قرار پائے ۔ لیکن اپنے مشاہدہ ، تحقیق و جستجو اور سروے کے جو نتائج ہاتھ لگے ۔ وہ خوش آئند سے زیادہ مایوس کن بلکہ تباہ کن ثابت ہوئے اور میرے خیال میں جو معاشرہ یا تحریک حقوق اب تک " ہر زن و شوہر کے تنازعات کا حل طلاق " کے بھنور میں نہیں پھنسی ہے ، اسے دوسرا مثبت راستہ اور منزل تلاش کرنی پڑے گی۔

کناڈا میں ۱۹۷۰ء کی دہائی میں طلاق کی بنا پر " واحد سرپرست " والے خاندانوں کی تعداد ۴۷۷۵۲۵ تھی ۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہ تعداد بڑھ کر ۷۱۴۰۰۵ تک جا پہنچی تھی ۔ یہ حقیقت وہاں کے لوگوں کے رہن سہن ، طرز زندگی اور زندگی کی معاشرتی اور اخلاقی تبدیلیوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے ۔ یہ صورت حال خوش آئند ہے یا غور و فکر کی دعوت دیتی ہے ؟.... تقریباً ۱۹۵۰ء تک دنیا کے دیگر ممالک کی مانند کناڈا میں بھی " باپ " کو خاندان کا سربراہ اور بچوں کا سرپرست سمجھا جاتا تھا ، لیکن اب یہ تصور معدوم روایت کی مانند کم و بیش ناپید ہو چلا ہے ۔ اب خاندان کی معاشی سرپرستی باپ کی ذمہ داری ہے اور سربراہی ماں کے حوالہ ۔ خاندان میں میاں بیوی کے درمیان خوش گوار ہم آہنگی کی بجائے تنازعات اور الجھاؤ بڑھتے جا رہے ہیں ۔ یہ جھگڑے عموماً آسانی سے حاصل ہونے والی طلاق پر ختم نہیں ہوتے بلکہ بچوں کی تحویل اور اخراجات کے سوال پر مزید جھگڑوں کو جنم دیتے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح کے ساتھ ساتھ سابقہ میاں بیوی کے درمیان مال و زر کے علاوہ بچوں کے " بانٹ بجزے " بھی لازماً ہو رہے ہیں ۔ پہلے جبکہ خاندان میں عملاً مرد کی

سربراہی ہوتی تھی، بچہ خواہ کسی کے پاس رہے، سرپرست باپ ہی ہوتا تھا۔ لیکن تب بچوں کی تحویل اور سرپرستی کے سلسلہ میں اتنا جھنجھٹ اور قانونی کارروائی کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے مختلف اسباب گنائے جا سکتے ہیں۔

(۱) اول تو طلاق کا چلن ہی کم تھا اور اگر شاذ و نادر طلاق ہو بھی جائے تو ماں خود چاہتی تھی کہ بچہ کو اس کے باپ کی سرپرستی حاصل رہے۔

(۲) بہت کم مطلقہ عورتیں معاشی طور پر بچوں کی کفالت کر سکتی تھیں۔

(۳) خاندان اور خاندانی نام کی اہمیت ہونے کی وجہ سے ماں اپنے بچہ کو اس کے باپ کے نام سے محروم کرنا پسند نہ کرتی تھی۔

(۴) شادی کے بندھن کے ساتھ ساتھ حالیہ برسوں میں بائلوجیکل رشتہ کا وقار بھی بڑی حد تک مجروح ہوا ہے، چنانچہ باپ اور بچہ کے فطری رشتہ کی اہمیت اب کم ہی تسلیم کی جاتی ہے۔

بچوں کے پس منظر میں آج کل کناڈا میں کئی قسم کے خاندان وجود میں آرہے ہیں۔ مثلاً:

(۱) "واحد والدین" والا خاندان

(۲) ماں اور اس کے بوائے فرینڈ پر مشتمل خاندان

(۳) باپ اور اس کی گرل فرینڈ پر مشتمل خاندان

تازہ ترین قسم طلاق یافتہ خاندان کی وہ ہے جس میں نابالغ بچہ سنگل پیرنٹ فیملی میں ایک سال اپنی ماں کے پاس مثال کے طور پر لندن میں رکھا جاتا ہے اور دوسرے سال باپ کی سنگل پیرنٹ فیملی میں مانٹریال میں۔ جیسا کہ ظاہر ہے ایسی صورت میں بچہ کا خاندان ہر سال تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ایک فریق کی تحویل سے لے کر بچہ کو دوسرے فریق کی تحویل میں دینے کے لئے اکثر اوقات اسکول کے احاطہ کا

انتخاب ہوتا ہے جسے غیر جانب دار تصور کیا جاتا ہے ۔ اس غیر جانب دار علاقہ میں انسانی حقوق اور بچوں کے حقوق کے محافظوں کے ہاتھوں بے جان اشیا کی مانند دو خود غرض انسانوں کے درمیان بچوں کی منتقلی ہوتی ہے ۔

کناڈا میں آج کل اکثر عدالتیں یہ فیصلہ بھی کرنے لگی ہیں کہ بچے حسب سابق اپنے گھروں میں رہیں اور باری باری علیحدہ شدہ ماں باپ معنیہ مدت کے لئے بچوں کے پاس آکر رہیں ، گویا بچہ ماں باپ کی گود سے علیحدہ کر دیا جائے لیکن مٹی کی دیواروں سے چمٹا رہے ۔ لازماً ایسی صورت میں بچوں پر زیادہ تباہ کن اثرات پڑتے ہیں ۔ اس قسم کا فیصلہ عدالتیں عموماً اس وقت کرتی ہیں جب ماں اور باپ دونوں میں سے کوئی بھی بچہ کو مستقل دوسرے کی تحویل میں دینے پر تیار نہیں ہوتا ۔ ددھیالی یا ننھیالی رشتہ داروں سے ملنے کی اجازت بچہ کو ہو یا نہ ہو ، اس کا عدالتی فیصلہ اور بھی مشکل ہے ۔ بہرحال طلاق یافتہ والدین کے بچے کس کی تحویل میں رہیں ، کس عزیز سے انہیں ملنے دیا جائے نیز اپنے ہی ماں یا باپ میں سے کسی ایک سے ہمیشہ کے لئے بچہ کو علیحدہ کر دینا اس کے حق میں مفید ہو گا کہ نہیں ، ان امور کا مبنی بر انصاف فیصلہ کرنا عدالتوں کے لئے بہت مشکل بلکہ سچ پوچھئے تو ناممکن ہے ۔ اکثر اوقات یہ فیصلہ بےچارے معصوم بچہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ خود یہ فیصلہ کرے کہ اس کی فلاح و بہبود کا مستقبل کس کے ساتھ رہنے اور کس سے ملنے جلنے میں زیادہ محفوظ رہے گا ۔ یہ ستم ظریفی قسمت کی دین نہیں ہے بلکہ طلاق کے لائسنس کے متوالوں اور خودغرضی کے مارے والدین کی پیدا کردہ ہے جس کا نشانہ بچے بن رہے ہیں ۔

طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح کے منفی اثرات و مضمرات ہم لوگوں کے اندازہ سے کہیں زیادہ ہیں ۔ یہ صرف دو افراد کی زندگی کا دھارا نہیں موڑتے بلکہ ان سے

متعلق بہت سارے لوگوں کو اپنی جگہ سے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ملکی معاشیات، قوانین، تعلیمی اداروں اور خود خاندان کے وجود کو (جو معاشرتی تنظیم کی اکائی ہے) طلاق کی بڑھتی ہوئی تعداد سے زبردست چیلنج درپیش ہے۔

کچھ ماہرین طلاق کا مشورہ ہے کہ اول تو خاندان کو ٹوٹنے سے بچانے کی ہر ممکن سعی ہونی چاہیئے۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو کم از کم ایسی صورت حال پیدا کی جائے کہ بچہ کا تعلق اور رابطہ نارمل طریقہ پر ماں اور باپ دونوں سے برقرار رہے۔ ٹوٹے ہوئے خاندان کے بکھرے ہوئے بچہ کو کسی حد تک نارمل احساس تحفظ اور جذباتی آسودگی دینے میں کچھ معاونت تو مل ہی جائے گی۔

کناڈا کے سنجیدہ اور سماجی مسائل کے اسباب اور ان کے حل پر تحقیق کرنے والا طبقہ تو اب اس بات پر بھی زور دے رہا ہے کہ طلاق شدہ والدین کے بچوں کا رابطہ اور ملنا جلنا اپنے ماں اور باپ دونوں کے عزیزوں سے حسب سابق رہنا چاہیئے تاکہ بچوں میں یہ اعتماد پیدا ہو کہ ان کے ماں باپ نے ایک دوسرے کو چھوڑا ہے، لیکن بچوں کو ان کے والدین یا عزیزوں نے نہیں چھوڑا ہے۔

میرا تاثر یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں لوگ اپنے انفرادی مسائل اپنی صحیح یا غلط روی سے پیدا کرتے ہیں، لیکن ان مسائل کو حل کرنے کا مطالبہ اور امید حکومت سے رکھتے ہیں حکومت کی طرف سے مشاورتی اور رفاہی اداروں کی بھرمار ہے، لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ معاشرتی اور سماجی مسائل روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔

تقریباً ۱۹۵۰ء سے جنسی انقلاب کی بہا دینے والی لہر نے سارے مسلمہ اور مروجہ اخلاقی حدود کو بیک جست پھلانگنا شروع کر دیا۔ قوم نے اپنی جمہوری فلاحی ریاست سے مطالبہ کیا کہ طلاق کی صورت میں ماں یا باپ سے جیتے جی بچھڑ جانے کی

وجہ سے بچوں کے اذہان اور نفسیات پر جو منفی اثرات پڑتے ہیں ، اس کے نام نہاد مداوے کے لئے سرکاری سطح پر لاتعداد مشاورتی ادارے اور نفسیاتی علاج کے مراکز قائم کئے جائیں ۔ آج کل تو کناڈا میں یہ آواز بھی سنائی دے رہی ہے کہ اسکولوں میں بچوں کو نصابی تعلیم کے علاوہ یہ بھی بتایا جائے کہ والدین کے درمیان طلاق ہونے کی صورت میں وہ اس صدمہ کو بلا کوئی ذہنی اثر لئے ہوئے کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں ، چنانچہ اسکولوں کے نصاب تعلیم میں یہ مضمون بھی شامل کرنے کی بات چل پڑی ہے کہ ماں باپ کے درمیان طلاق کی صورت میں بچے اس فطری کرب اور کرائسس کا مقابلہ کیسے کریں ۔ مشاہدہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مختلف بچوں پر ماں باپ کے درمیان طلاق کی صورت میں مختلف نوع کے منفی اثرات ظاہر ہوتے ہیں ۔ بعض بچے بالکل خاموش اور دنیا سے بیزار ہو جاتے ہیں ۔ پڑھائی کی طرف سے ان کا دھیان ہٹ جاتا ہے ۔ کچھ بچے ذہنی طور پر بہت الجھ جاتے ہیں اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ماں اور باپ دونوں میں سے کس سے انہیں زیادہ تحفظ اور شفقت مل سکتی ہے ۔ اکثر بچے اپنا گھر اور گھریلو محبت کھو دینے کی وجہ سے تخریبی رجحان کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ٹوٹے ہوئے گھرانوں کے بچوں کے مسائل کے بارے میں ان کے اساتذہ کی کیا رائے ہے ، میں نے کئی پرائمری اور ہائی اسکولوں کے اساتذہ سے باتیں کیں ۔ ایک بات جس پر تقریباً سبھی متفق ہیں ، وہ یہ ہے کہ بچہ کتنے مختلف انداز سے ماں باپ کے درمیان علیحدگی پر رد عمل کا اظہار کرتا ہے یا اثر لیتا ہے ۔ ان سبھوں کا احاطہ کرنا مشکل ہے ، لیکن اتنی بات طے ہے کہ پھر وہ وہ نہیں رہ جاتا جو پہلے تھا ۔

بچوں کو طلاق کے بھیانک اثرات سے بچانے کی سعی ، مشاورتی اداروں ، اسکول کے نصاب تعلیم اور اساتذہ اور نفسیاتی اداروں کے کرنے کی بات جب سامنے

آتی ہے تو محاورہ یاد آتا ہے "مدعی سست گواہ چست" والا ۔ ماں باپ، جنہیں بچہ کے جذبات، احساسات، ضروریات، ان کی نشوونما اور مستقبل کا خیال اور ذمہ داری ہونی چاہیئے، وہ تو ایک دوسرے کے ساتھ اپنے بچوں کی خاطر کوئی سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ یہ ان کی ذاتی خوشی، آزادی اور ذاتی حقوق کی پامالی ہو گی، لیکن سماجی فلاح کے ادارے اور تعلیمی ادارے ان کے بچوں کو والدین کی پیدا کردہ دلدل سے نکالیں ۔

بہت عرصہ نہیں گذرا جب فرد کے حقوق کے نام پر تقریباً دنیا کے ہر قابل ذکر ملک میں سماجی اصلاح پسند طلاق کو آسان تر بنانے کی کوشش کرتے تھے ۔ اب بہت سارے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں طلاق حاصل کرنا بہت آسان ہو گیا ہے، لیکن آثار بتاتے ہیں کہ طلاق کی برکتوں سے مکمل طور پر فیض یاب ہونے سے پہلے ہی اس کے نتائج اور اس سے جنم لینے والے مسائل نے لوگوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے ۔ اب تو ایک نئی اصطلاح بھی کناڈا میں خاصی رائج ہو گئی ہے اور طلاق شدہ والدین کے بچے اب "GUNEA PIG GENERATION OF CHILDREN" کہلاتے ہیں ۔ ٹھیک ہی تو ہے یہ بچے، جو طلاق کے تجربہ کا شکار ہو رہے ہیں، انہیں اس سے بہتر نام دیا بھی کیا جا سکتا ہے ۔

UNICEF نے کچھ عرصہ قبل ترقی پذیر ممالک میں بچوں کی حالت زار کے بارے میں بہت ہی بھیانک اعداد و شمار دیئے تھے، لیکن ان اعداد و شمار سے حالات کا بالکل صحیح اندازہ ہو سکے، ایسا بھی نہیں ہے اور خود UNICEF نے بھی یہ بات تسلیم کی تھی ۔ تیسری دنیا میں بہت ساری محرومیوں کے باوجود بھی بچوں کے لئے کچھ ایسی خوش گوار حقیقتیں موجود ہیں جن کا جائزہ اعداد و شمار کے ذریعہ نہیں لیا جا سکتا اور جو صنعتی ممالک میں مفقود ہیں ۔ ترقی پذیر ممالک میں مادی ذرائع کا افلاس ہے تو

ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں ایک مختلف قسم کا افلاس موجود ہے۔ تنہائی کا افلاس، اپنے وجود کے بے کار اور غیر ضروری ہونے کے احساس کا افلاس، جذباتی اور نفسیاتی افلاس۔

مادی خوشحالی میں بے تحاشا اضافہ اور ترقی نے انسانی رشتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کے پاس وقت کی اتنی تنگی ہے کہ ایک شخص اپنے بیمار عزیز و اقارب اور دوست کی عیادت کے لئے بھی وقت نہیں نکال سکتا ہے۔ وقت کی تنگی کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص دولت کمانے کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہے۔ دولت، جو اشیائے ضرورت کی فراہمی کے لئے نہیں بلکہ ان خواہشات کی تکمیل کے لئے حاصل کی جاتی ہے جنہیں اشتہار بازی اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ضرورت میں شامل کر لیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فرد نہ صرف دوست بلکہ اپنے ماں باپ، بھائی بہن یا بیٹا بیٹی پر بھی گھنٹے آدھ گھنٹے کی وہ توجہ صرف نہیں کر سکتا جن کی انہیں ضرورت ہے اور جس کے عوض اسے نقد معاوضہ نہیں ملتا ہے اور یہ حقیقت غیر انسانی ہے۔ خوش قسمتی سے غیر ترقی یافتہ ممالک میں انسانی رشتوں کا یہ بندھن آج بھی نسبتاً پائدار ہے۔ بچے، جنہیں پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا ہے، متوازن غذا اور مناسب طبی امداد میسر نہیں ہے، جو تعلیم حاصل کرنے کے وسائل سے محروم ہیں، انہیں کم از کم ایک مثبت آسائش حاصل ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرہ میں پرورش پا رہے ہیں جہاں اب بھی انسانی رشتوں کی قدر و قیمت باقی ہے۔ انسانی بھائی چارگی کا جذبہ موجود ہے، جہاں بھائی بہن یہ نہیں بھولتے کہ انہوں نے ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور جہاں ضرورت پڑنے پر یہ رشتے ایک دوسرے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ آج صنعتی ممالک میں یہ اقدار بالکل ناپید ہو کر رہ گئی ہیں۔ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور محبت میں کمی آتی جا رہی

ہے ۔ وہ ممالک جو مادی طور پر بہت خوش حال نہیں ہیں ، وہاں ماں اور بچہ میں بہت نزدیکی رابطہ اور لگاؤ ہوتا ہے ۔ وہاں بچوں کو صرف ماں باپ ہی کی شفقت میسر نہیں ہوتی بلکہ دادا دادی ، چچا ماموں کے علاوہ ہمسایوں کا بھی پیار ملتا ہے ۔ برخلاف اس کے امریکا کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق لاکھوں بچے ایسے ہیں جو اسکول سے گھر واپس جاتے ہیں تو وہاں کوئی ان کی نگہداشت کرنے والا نہیں ہوتا ۔

## زندگی کا ایک غیر متوقع انوکھا لطیفہ

یعنی

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچہ میں ہم آئے

پتا نہیں میرے ہی ساتھ ایسے ایسے انوکھے حادثات و واقعات کیوں ہوتے ہیں جن کا عام حالات میں امکان بھی نہیں ہوتا ۔ ویسے اگر معمولی واقعات میرے ساتھ غیر معمولی حوالہ سے پیش نہ آتے تو بھلا رہتا ہی کیا میرے پاس ۔

اپنے حالات زندگی لکھنے کے لئے ، اب اسے حالات کی ستم ظریفی نہ کہیں تو کیا کہیں کہ ۱۹۷۴ء میں جب میں پہلی بار ملک سے باہر ہالینڈ گئی تھی تو میرے پاس ویزے یا داخلہ کا اجازت نامہ نہ تھا ۔ پتا نہیں کیوں میرے بیٹے تنویر کو یہ غلط فہمی تھی کہ ہالینڈ جانے کے لئے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ بہرحال کسٹم والوں نے مجھے روک لیا ۔ ڈچ زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشکلوں سے میں اپنی بات انہیں سمجھا سکی اور انہیں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ تنویر سے رابطہ قائم کرنے کو کہا ، چنانچہ تنویر تو باہر تھے ہی ۔ وہ اپنے ورک پرمٹ کے ساتھ اندر آئے اور یوں میرے لئے مسئلہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی غیر مذہب ، غیر نسل اور گوری رنگت والوں نے

اپنے تعاون سے اسے حل کر دیا۔

کم و بیش اسی طرح کا واقعہ گیارہ سال بعد، یعنی ۱۹۸۵ء کے دسمبر میں، اس وقت پیش آیا جب میں جدہ گئی۔ اس دوران غیر ملکوں کے سفر تو ان گنت ہو چکے تھے، لیکن جدہ (سعودی عرب) جانے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ تواریخ نے اپنے آپ کو یوں دہرایا تھا کہ اس بار بھی تنویر نے مجھے اسپانسر کیا تھا اور سعودی عرب کے قانون کے مطابق میرے ضامن تھے۔ میرے پاسپورٹ پر جدہ میں داخل ہونے کا باقاعدہ ویزا لگا ہوا تھا جسے میں نے بہت پاپڑ بیل کر اور حلفیہ بیان دے کر حاصل کیا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور کسی دوسرے فرقہ کے مذہب کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ علیحدہ داستان ہے کہ اپنے مذہبی عقیدہ کے تحریری اعلان کے لئے کراچی میں فارن آفس جا کر آفس سے باہر منڈلاتے ہوئے حلفیہ بیان لینے والوں کو رشوت دے کر یہ سرٹیفیکیٹ حاصل کرنا پڑا۔ بہرحال بات ہو رہی تھی تواریخ کے اپنے آپ کو دوہرانے کی، سو اگر یہ سچ ہے کہ تواریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ تواریخ اپنے آپ کو بعینیہ نہیں دہراتی، چنانچہ جدہ ایرپورٹ پر مجھ پر کیا کچھ گذری، اس کی تفصیل دلچسپ ہے۔

ہوائی جہاز کے سفر کے بڑے سے بڑے ماہرین پر بھی میرے خیال میں چیکنگ وغیرہ کے وقت گھبراہٹ ہی نہیں بلکہ بوکھلاہٹ سی طاری ہو جاتی ہے۔ کم از کم میرا اپنا تجربہ تو یہی بتاتا ہے۔ منزل پر پہنچ کر جہاز کے باقاعدہ لینڈ کرنے سے چند منٹ پہلے ہی سے ہر مسافر (سوائے وی۔آئی۔پی۔ شخصیتوں کہ اولیت تو ان کا حق اور مقدر ہے) جہاز سے اترنے والوں میں پہلا ہونے کی جدوجہد شروع کر دیتا ہے اور جب ہر شخص کا ایک ہی رویہ ہو تو انبوہ کی تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ خیر! جدہ میں کنگ خالد ایرپورٹ پر میری اول آنے کی تگ و دو نے زندگی میں پہلی بار مجھے

یوں سرفراز اور کام یابی سے ہم کنار کیا کہ میرا سامان بھی فوراً ہی مل گیا اور کسٹم کرانے والوں کی قطار میں بھی مجھے اول جگہ ملی، چنانچہ میں نے بڑی گہری اور اطمینان کی سانس لے کر آخری مرحلہ طے کرنے کے لئے اپنا پاسپورٹ ویزا متعلقہ افسر کے حوالہ کیا اور اشتیاق اور آس بھری نظروں سے کھڑی انہیں تکتی رہی ۔ افسر صاحب نے ایک سرسری نظر سے (یا شاید بنظر غائر جس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا) میرے پاسپورٹ کا معائنہ کر کے عربی میں کچھ فرمایا اور پاسپورٹ اپنے پاس رکھ کر مجھے ایک کونے میں کھڑے ہونے کا اشارہ کیا ۔ میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی ۔ اب کیا دیکھتی ہوں کہ مسافر آ رہے ہیں، پاسپورٹ بڑھاتے ہیں، ضروری کارروائی ہوتی ہے اور مسکراتے ہوئے اگلے مرحلہ کو طے کرنے کے لئے بڑھ جاتے ہیں ۔ جب کافی دیر کونے میں کھڑے ہوئے ہو گئی (ویسے مجھے تو محسوس ہو رہا تھا کہ صدیاں گذر گئیں اور اس وقت اتنا ہوش کہاں تھا کہ صدیوں کی مدت محسوس کرنے سے پہلے سوچ لیتی کہ بے چارہ انسان اتنا عرصہ کہاں جی سکتا ہے اور وہ بھی کونے میں کھڑے ہو کر) تو میں نے جان پر کھیل کر ہمت کی ۔ آگے والوں سے دھکا کھاتی، ان کی نظر عتاب سے آنکھیں چراتی، ہزار دقت کاؤنٹر تک پہنچی اور یہ معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی کہ آخر میرے ہی پاسپورٹ سے اس کسٹم افسر کو کیا خاص الفت ہے جو اسے روک رکھا ہے ۔ معلوم ہوا کہ میرا کفیل، یعنی میرا بیٹا تنویر، اندر موجود نہیں ہے، اس لئے میرا پاسپورٹ مجھے واپس نہیں ملے گا ۔ میں نے ہالینڈ کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کا فوری فیصلہ کیا اور متعلقہ افسر کو سمجھانے کی قطعی ناکام کوشش کی کہ میرا کفیل ضرور ایرپورٹ سے باہر میرا انتظار کر رہا ہو گا اور اگر اس کی ضرورت اندر ہے تو لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے اسے اندر بلا لو، مگر صاحب! میری بات کی منطق اگر ان کی سمجھ میں آ ہی جاتی تو پھر یورپ والوں نے کسی زمانہ میں ایشیائی اقوام کو سفید قوموں کا بوجھ

کیوں کہا ہوتا اور پھر تواریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے، یہ مفروضہ بھی طے ہو جاتا۔ میں نے زیادہ ہی جرح کرنے کی کوشش کی تو چڑ چڑا کر اس نے دوسرے عملہ سے کہا،

" انہیں .... (ویسے یہ لفظ تو میں نے اپنی عزت افزائی کے لئے استعمال کیا ہے ورنہ کسٹم کے افسر نے تو کسی اور ہی لقب سے نوازا تھا جسے دوہرانا جگہ کی قلت اور بے موقع ہونے کی وجہ سے فی الحال میں ملتوی کرتی ہوں) پولیس کے حوالہ کرو!" دوسرا افسر جو ذرا کم خر دماغ بلکہ کسی حد تک بھلا مانس سا تھا، اس بے چارہ کو ہم پر بہت ترس آیا۔ پولیس والے، جو ہمیں حوالات لے جانے کے لئے آچکے تھے، انہیں مزید کارروائی سے روک کر کسٹم کاؤنٹر سے ایک پاسپورٹ اور ایک اقامہ کا کارڈ وہ میرے پاس لائے،

" دیکھئے! یہ فوٹو آپ کے بیٹے کی ہے؟" پاسپورٹ کسی بتولن بوا کا تھا اور ان کا کفیل رحیم پلمبر تھا۔ جی چاہا کہ پاسپورٹ ان کے ہاتھ سے چھین کر پرزہ پرزہ کر دوں یا ان کے منہ پر دے ماروں، لیکن چونکہ یہ وقت غصہ کرنے کا نہیں بلکہ گدھے کو بھی باپ کہہ لینے کا تھا، اس لئے صرف نفی میں سرہلانے پر اکتفا کرنے ہی والی تھی کہ دیکھا سامنے سے تنویر سراسیمہ دوڑے چلے آرہے ہیں۔ اصل میں تنویر کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ انہیں خود سے اندر آکر میری ضمانت لینی تھی۔ وہ گھنٹوں سے باہر کھڑے نوید ملنے کا انتظار ہی کرتے رہے۔

بہرحال انجام اس سارے قصہ کا یہ ہوا کہ ہم لوگ خوشی خوشی کار میں بیٹھ کر تنویر کے گھر روانہ ہوئے۔ ہاں! یہ بتاتی چلوں کہ روانہ ہونے سے پہلے ایک دوسرے سے ملنے اور اپنے جیل نہ جانے کی خوشی میں ایک دوسرے سے گلے بھی ملے۔

جدہ بہت ہی ماڈرن اور حسین ترین عمارتوں، فلیٹوں شاپنگ پلازوں اور

جانے کن کن دلکش و ہوش ربا شہری لوازمات سے مزین شہر ہے ، لیکن شاید اسے تضادات کا شہر کہنا نامناسب نہ ہو گا ۔ باہر سڑکوں پر صرف مرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ۔ اگر کسی دوسرے سیارہ ، یعنی مریخ وغیرہ کا کوئی باشندہ اپنی اڑن طشتری پر اوپر ہی اوپر سے شہر کا نظارہ کرے تو یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ یہ "یک صنفی" شہر ہے ۔ برخلاف اس کے شاپنگ پلازا ، شاپنگ مال اور اچھے اچھے ماڈرن ریستوران میں جائیں تو پتا چلتا ہے کہ "ہاں ! رنگ بہاراں" کا فقدان نہیں ۔ لڑکیاں اور عورتیں فیشن ایبل قسم کا سیاہ عبا پہنے ، چہروں پر نکھار حسن کے سارے ہتھیار سجائے صنف مخالف کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ ان سے چند قدم آگے ہی چلتی پھرتی ہنستی بولتی اور خریداری کرتی نظر آتی ہیں ۔

غیر ملکیوں کو گھر سے باہر نکلتے وقت اپنا پاسپورٹ اور اقامہ ہمیشہ ساتھ رکھنا پڑتا ہے ورنہ گرفتاری کا خدشہ ہوتا ہے ۔ ویسے گرفتار ہونے سے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا اس امکان سے کہ کہیں مدتوں ، کردہ اور ناکردہ جرم کی سزا میں ، جیل میں سڑنا نہ پڑے کہ یہ بھی کثرت سے سننے میں آیا کہ پولیس والے اکثر کسی معمولی سی کوتاہی یا غلط فہمی کی بنا پر جیل میں ڈال کر بھول جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو مر بھی جاتے ہیں ۔ ایسی حالت میں کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ لاپتا ہونے والا بدنصیب کس جیل میں سسک رہا ہے ۔ پولیس والے اکثر بہت کم عمر اور ڈھیلے ڈھالے دیکھے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فرائض منصبی کیسے انجام دیتے ہوں گے ۔ بہرحال انجام تو بھلے برے دیتے ہی ہیں اور فرض شناس بھی خاصے ہیں ، تبھی تو اتنا جلدی مجھے جیل لے جانے کے لئے آموجود ہوئے تھے ۔

جدہ پہنچنے کے دوسرے روز جمعہ تھا اور اولین فرصت میں عمرہ کی ادائگی نصب العین تھی ، لہٰذا ہم لوگ کار سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے ۔ عفت نے عمرہ کے سارے

ارکان مجھے ازبر کرا دیئے اور احتیاطاً ایک کتاب بھی تھما دی اور یہ بھی سمجھایا کہ صفا مروہ کے اختتام پر تھوڑا سا بال کٹوانا پڑتا ہے (چوٹی نہیں) اور یہ کہ عورتیں قینچی لئے اس مقصد کے لئے کھڑی رہتی ہیں۔ بس انہیں کچھ ہدیہ دینا پڑتا ہے۔ خیر! چونکہ عفت ہمارے ساتھ ساتھ تھیں اور عمرہ کا فریضہ مجھ سے صحیح طور پر انجام پائے اس کی ذمہ داری انہوں نے لے رکھی تھی، اس لئے میں نے پورے سکون قلب، دل جمعی اور دلی جذبہ کے ساتھ (مانگے کا عبایا پہن کر) عمرہ کے آخری رکن، یعنی صفا مروہ کے سات پھیرے لگائے اور پھر قینچی لئے ہوئی عورت کے سامنے سر کھول کر کھڑی ہو گئی

"ارے ارے! یہ کیا؟ سر چھپائیے۔ پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ مارے گا۔" میرے پیچھے کھڑی ہوئی کوئی ہم وطن اور ہمدرد خاتون بوکھلا کر چلائیں۔ میں جو عبایا پہن کر صحیح طور پر عمرہ کی ادائگی کر کے بال کٹوانے کھڑی ہوئی تھی، فوراً ہی کچھ سمجھ نہ پائی۔ خیر! مار پڑنے سے پہلے ہی پتا چل گیا کہ ڈھکے ہوئے سر کے پیچھے سے بالوں کی ایک لٹ نکال کر کٹنے کے لئے دینی ہوتی ہے کہ وہاں مردوں کی موجودگی میں پورا سر کھولنے سے بے پردگی ہو جاتی۔ میں نے اللہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا کہ یہاں بھی بال بال پولیس والوں سے بچے اور تنویر اور عفت سے عمرہ کی مبارک باد لے کر سرخرو گھر لوٹی۔

عام طور سے ہمارے یہاں سے جو لوگ روزگار کے لئے جاتے ہیں، ان کا ملنا جلنا اور سماجی تعلقات اپنی ہی طرف کے لوگوں سے ہوتے ہیں۔ بہت مشکلوں سے کچھ سعودی عورتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ کچھ پڑھ کر، کچھ سن کر اور کچھ ان سے مل کر اور ان کے گھروں میں جا کر جو معلومات حاصل ہوئیں، ان سے میں نے اندازہ لگایا کہ سعودی عرب میں بھی معاشرتی زندگی کا سفر قدامت سے جدیدیت کی طرف رواں ہے بے شک دواں نہ ہو۔ لڑکیوں میں تعلیم اور اکا دکا کے حساب سے اعلیٰ تعلیم بھی

پھیل رہی ہے۔ حکومت بھی عورتوں میں تعلیم رائج کرنے کے لئے قابل تعریف اور ہمت افزا اقدامات کر رہی ہے۔ قابل تعریف اس لئے کہنا پڑا کہ جس ملک میں عورتیں اب بھی عموماً حرم کی زینت کے سوا دوسری حیثیت نہ رکھتی ہوں، وہاں نئی نسل کی بچیوں کو اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے کا موقع ملے، یقیناً قابل تحسین ہے۔ عرب خواتین کو پردہ کرنا اور برقع یا عبایا پہننا لازمی ہے۔ پھر بھی یونیورسٹی میں خاصی تعداد سعودی لڑکیوں کی زیر تعلیم ہے۔ یہ مرد اساتذہ کے روبرو تو نہیں، لیکن ٹی۔وی۔اسکرین کے ذریعہ تعلیمی مباحثوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں نے سعودی معاشرہ کے عام گھرانوں کی عورتوں کی ذہنیت اور ان کی عام صلاحیت کا جو خاکہ ذہن میں بنا رکھا تھا، ذاتی مشاہدہ کے بعد اس سے بہت مختلف پایا۔ نئے سعودیہ میں عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے کوئی منظم تحریک اور تنظیم نہیں ہے۔ وہ اس لئے بھی کہ سعودی حکومت کسی منظم تنقید، مطالبہ یا تنظیم برداشت کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتی، خواہ وہ مردوں کی تنظیم ہو یا عورتوں کی۔ خیر! آمدم برسر مطلب یہ کہ نئی نسل کی لڑکیاں کسی تنظیم کے نہ ہونے کے باوجود بھی دنیا کی سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کا اثر، اگرچہ آہستہ روی سے، لیکن قبول ضرور کر رہی ہیں۔ اپنے انسانی حقوق کا شعور بھی ان میں جڑ پکڑ رہا ہے۔ اگرچہ گھر سے باہر بامعاوضہ روزگار کے مواقع عورتوں کے لئے بہت محدود ہیں، پھر بھی عورتوں کی بے روزگاری کا احساس اس لئے بھی نہیں ہوتا کہ نسبتاً تعلیم یافتہ یا روزگار کی خواہاں خواتین کا تناسب بھی دوسرے ترقی پذیر مشرقی ممالک کے مقابلہ میں ابھی بہت کم ہے۔ اتنا ہی کم ہے کہ ہم جیسے لوگ جب کسی سعودی عورت کو یونیورسٹی کی طالبہ کی حیثیت سے ملتے ہیں تو لگتا ہے کسی عجوبہ روزگار سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

جدہ میں سعودی خواتین کا بینک بھی دیکھا۔ اس بینک میں نیچے سے اوپر تک سارا عملہ صرف عورتوں پر مشتمل ہے۔ تعلیم یافتہ عورتیں مواقع کی کمی، معاشرتی، سماجی اور پردہ کی پابندیوں کے باوجود مجھے خاصی ذہین اور سوچنے سمجھنے اور جاگتا ہوا دماغ رکھنے والی لگیں۔ جذبہ اور عمل کی ہمت بڑھانے کے لئے ایک مہمیز کی ضرورت بے شک ہے۔

لڑکیوں کی شادی کے لئے عام طور سے ماں باپ بر ڈھونڈتے ہیں اور اکثر کم سنی ہی میں بیاہ دیتے ہیں، لیکن اب جیسے جیسے لڑکیوں میں تعلیم پھیل رہی ہے اور دوسرے ممالک کی عورتوں کے حالات اور مطالبات سے واقفیت ہو رہی ہے، اپنی پسند اور ماں باپ کی مرضی کے خلاف بھی شادی کرنے لگی ہیں۔ طلاق تو ہندوستان پاکستان کے مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلے بھی زیادہ ہوتی تھی، لیکن تب اور اب میں نمایاں فرق یہ رونما ہوا ہے کہ اب عورتوں کی طرف سے بھی خلع کا مطالبہ کافی ہونے لگا ہے۔ ۱۵، ۲۰ سال پہلے تک سعودی عورت کے لئے مطلقہ ہونا کلنک کا ٹیکا ہو یا نہ ہو، لیکن عورت کے لئے ناپسندیدہ ضرور سمجھا جاتا تھا۔ اب اس کی شدت میں بدلتے زمانہ کے دباؤ کے تحت کمی تو ضرور آگئی ہے، لیکن عام طور سے سعودی معاشرہ میں مطلقہ عورت کو ابھی بھی ایک حد تک ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ماں باپ، عزیزوں، رشتہ داروں اور سماجی اقدار کا تقاضا ہوتا ہے کہ شادی کے بعد خواہ لڑکی پر کچھ بھی گذرے، اسے شوہر سے طلاق لینے میں اپنی طرف سے پہل نہیں کرنی چاہیئے۔ مطلقہ عورت جب تک دوسری شادی نہیں کر لیتی والدین یا سرپرستوں کی اعانت کی محتاج ہوتی ہے اور ظاہر ہے اس محتاجی کا خوش آئند ردعمل تو ہونے سے رہا۔ پھر تعدد ازدواج کا رواج عام ہونے کی وجہ سے بیویاں ڈرتی ہیں کہ کہیں مطلقہ عورت ان کے شوہروں کو ہتھیا نہ لے۔ اس حقیقت کے باوجود

کہ عورت کا طلاق شدہ ہونا سعودی معاشرہ نے اب تک کھلے دل سے قبول نہیں کیا ہے، اکثر عورتیں کئی کئی بار طلاق کے بعد بار بار شادیاں کرتی ہیں۔ ہم نے سعودی عورتوں سے بات چیت کے ذریعہ جب طلاق کے بارے میں یہ معلومات حاصل کیں تو ہمیں اس عام تاثر کی نفی کرنی پڑی کہ سعودی عرب میں عورتوں کا خلع لینا بہت عام ہے اور اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

ہم وطن واپسی پر اپنی تفتیش و جستجو کے نتیجہ میں بہت سے نئے حقائق کا علم بھی ساتھ میں سمیٹ لائے۔ ان میں سے بعض باتیں تو ہم جانتے تھے (سنی سنائی) اور بعض کا انکشاف ہوا۔ مثلاً یہ کہ عورتوں کے طلاق لینے کو معاشرہ میں اچھا نہیں سمجھا جاتا جبکہ دوسری طرف عورتوں کو خلع حاصل کرنے کی خاصی سہولت ملی ہوئی ہے یا یہ کہ والدین کی مرضی کے خلاف محبت کی شادی کا بھی رواج ہے، حالانکہ پردہ کی بھی سخت پابندی ہے۔ مردوں کے تعدد ازدواج کو عام طور سے عورتیں ان کا مذہب سے عطا کیا ہوا حق سمجھتی ہیں، لیکن پھر بھی دعویٰ دار ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو مساوی حقوق ہیں۔ سو سعودی معاشرہ بھی اکثر متضاد دھاروں میں بہتا ہوا محسوس ہوا۔

سوویت یونین کے زوال اور سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد اقوام عالم کی تقدیر امن و آشتی کے گہوارہ میں جھولنے کی بجائے (جیسا کہ سویت یونین کے دشمنوں کا دعویٰ تھا) شدید آپسی نفرت، تشدد اور ہلاکت خیز تخریب کاری کے بھینٹ چڑھتی نظر آرہی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی فتنہ و فساد، تباہی اور جنگ ہے وہاں دو مخالف یا متحارب فریقین میں ایک یا اکثر تو دونوں ہی اسلامی ملک یا اسلامی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے میں دونوں ہی اپنے آپ کو اسلام کا علم بردار اور مسلمانوں کے مفاد کا امین سمجھتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک ہر قسم کا مذہبی تشدد اور

تنگ نظری اس مقصد کے پیش نظر جائز بلکہ ضروری ہے کہ ان کے اپنے مخصوص عقیدہ کو ساری دنیا میں عالم گیر حاکمیت حاصل ہو سکے ۔ لیکن نتیجہ آج تک منفی ہی نکلا کہ بین الاقوامی سطح پر دنیا میں مختلف سماجی ، سیاسی اور مذہبی اقدار پائی جاتی ہیں ۔ جب تک کہ ساری دنیا میں ایک قدر مشترک کا دور دورہ نہ ہو جائے ، قومیں ایک جھنڈے تلے اپنا اقتدار اعلیٰ سونپنے کو تیار نہیں ہوں گی جو ناممکن سی بات ہے ۔ ایسے میں کسی بھی مسلم اکثریتی ملک سے سیکولر اور مذہبی رواداری برتنے یا اس جذبہ کے پنپنے کی بات سنئے تو انسان اور انسانیت کا ڈانوا ڈول ہوتا مستقبل پھر سے روشن اور امید افزا نظر آنے لگتا ہے ۔ ملائشیا کو بھی ہم دیگر بہت سارے مسلم ممالک کی مانند کٹر رجعت پرست سمجھتے تھے ۔ جب یہ جان کاری ملی کہ ساٹھ فی صد مسلم آبادی ہونے کے باوجود ۱۹۸۳ء سے وہاں ایک بین الاقوامی یونی ورسٹی قائم ہے جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور یہ یونی ورسٹی اسلامی ہوتے ہوئے بھی جدیدیت اور سیکولرزم کی علم بردار ہے تو بڑی خوشی ہوئی ۔

## ملائشیا، اسلام اور اجتہاد

اسلامی دنیا عمومی طور پر غیر عقلی اور غیر انسانی کٹر پرستی کے جس بحران سے روز افزوں دو چار ہو رہی ہے ، اس سے نجات کے لئے یہ یونی ورسٹی بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں سے نمٹنے کے لئے اسلامی تعلیمات کے مطابق نئے اجتہاد کے لئے سرگرم عمل ہے ۔ اس یونی ورسٹی کے بہت سے قابل اسکالروں نے اسلامی دنیا پر بحران کے منڈلاتے بادل کے حوالہ سے قرآن شریف کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اللہ کے منشا کے عین مطابق ہے کہ نئے حالات کے مطالبات کے مطابق اسلامی روشنی میں نئے اجتہاد کئے جائیں ۔

معاشی اصلاحات و انصاف اور انقلابی تبدیلیوں کے بنیاد پرست مخالفین روایتی طریقہ پیداوار و تقسیم اور غیر منصفانہ معاشرتی تنظیم اور اصول و ضوابط سے علیحدہ کوئی تبدیلی لانے یا برداشت کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے اسلام کو کاستاتی مذہب، جدیدیت، انسان دوستی اور ہمہ گیر صلح و آشتی کی نظر سے دیکھنے، پرکھنے اور عقیدہ رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اسلام کسی بھی جدید طرز زندگی کی مخالفت نہیں کرتا تاوقتیکہ یہ طرز زندگی بنی نوع انسان کے مفاد کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ آج ملائشیا میں خوش آئند اور امید افزا اصل صورت حال یہ ہے کہ ایک مثبت سیکولر تحریک زور پکڑ رہی ہے جس کا مقصد قرآن شریف کو اپنی اصل اور اوریجنل شکل میں تعلیم کے لئے پیش کرنا ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔

بہرحال یہ بات تعجب خیز ضرور ہے کہ اس دور افتادہ اسلامی کیمونٹی میں اتنی سوجھ بوجھ، ہمت اور وسعت نظری کیسے آگئی۔ تجزیہ کرنے سے دو معاون عوامل سامنے آتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ملائشیا میں اسلامی عقیدہ کو متعارف کرانے اور پھیلانے والوں میں عرب فاتحین کی بجائے عرب تاجر تھے۔ چنانچہ اہل اقتدار کے ظلم و تشدد سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان تاجروں کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر لوگ اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ گذشتہ کئی عشروں سے ملائشیا میں خاصی معاشی ترقی ہوتی رہی ہے اور مسلسل ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے صدیوں تک ملائشیا والوں کا خاص پیشہ کھیتی باڑی اور زراعت تھا۔ اب بھی بہت سے مسلمان اسی پیشہ سے منسلک ہیں اور ترقی، روشن خیالی اور قلبی وسعت نظری سیکولرزم کی پہلی منزل ہے۔

اب یہ تاثر عام لوگوں میں بھی جڑ پکڑتا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے حالیہ زوال کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ہر مشکل، ہر خامی، کوتاہ اندیشی و کوتاہ بینی

ناکامی، تنزل اور شکست کا الزام یا تو اپنے نو آبادیاتی دور کے آقاؤں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں یا امریکا کے سر۔ بجائے اس کے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں، مسلمان قومیں اور افراد اپنی نکبت و خواری کی ذمہ داری دوسرے ترقی یافتہ ممالک اور غیر مذہب والوں پر ڈالتے ہیں اور اپنے آپ کو ہر طرح نہ صرف بری الذمہ بلکہ مظلوم سمجھتے ہیں، گویا پوری دنیا اسلام کے خلاف بر سرپیکار ہو۔ یہ انداز عمل اور انداز فکر نہ صرف شکست خوردہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ مستقل شکست و ہزیمت کا ضامن ہے۔ خود مسلم ممالک کے آپس کے تعلقات کیا ہیں، ایک دوسرے پر کیا ظلم روا رکھتے ہیں، اس حقیقت کی طرف بنیاد پرستوں کی نظر نہیں جاتی مختلف مسلم ممالک کی کیا بات کریں، خود ایک ہی اسلامی ملک میں رہنے والے مختلف اسلامی مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ ملائشیا کے ترقی پسند دانش ور اب کھل کر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اپنی نکبت و خواری کے لئے مسلمان خود ذمہ دار ہیں۔ مذہب کے نام پر بدعنوانی، بنیادی انسانی حقوق کی نفی، عورتوں کے ساتھ عدم مساوات، معاشی عدم مساوات ظالمانہ طرز حکومت کی اسلام کے نام پر حمایت، مذہبی اقلیتوں کے ساتھ اچھوتوں سے بھی بدتر برتاؤ، مذہبی منافرت، تعصب وغیرہ وغیرہ یہ ایسے عوامل ہیں جو اسلامی ممالک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ بے شک بہت ساری انسانی اور روحانی اقدار تھوڑے بہت اختلافات کے باوجود ایسی ہیں جو ساری بنی نوع انسان کی مشترک میراث ہیں جنہیں سبھی جانتے اور مانتے ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی مذہب و ملت سے ہو۔ ملائشیا کے ترقی پسند غیر متعصب مسلمان دانش ور یہ تسلیم اور اس کا پرچار کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اگر مسلمان بن کر زندہ رہنا ہے تو انہیں یہ تسلیم کرنے میں جھجک نہ ہونی چاہئے کہ اس دنیا میں مختلف مذہبی اور مادی مکاتیب فکر

موجود ہیں اور یہ سب انسانیت کی مشترکہ میراث اور مثبت اقدار کے حامل ہیں اور ہمیں اس ورثہ کو اختلافات اور تنازعات کے باوجود اپنانا ہے تا وقتیکہ ان سے انسانیت کی راہیں مسدود نہ ہوتی ہوں۔ کھوکھلے نعروں سے مغربی تعلیم، مغربی مادہ پرستی اور دوسرے مذاہب کو ہدف تنقید بنانا لاحاصل بلکہ نقصان دہ ہے۔ اگر ملائشیا کی سوچ کی یہ نئی ڈگر سارے مسلمان اپنالیں تو انسان اور اسلام دونوں ہی کا بول بالا ہو۔

## اردن ۔ انتخابات اور خواتین

اردو کی پہلی خاتون رکن پارلیمنٹ تورجن فیصل کی کام یابی نے اردن کی سیاسی تواریخ اور خواتین کی جدوجہد میں ایک نئے انقلابی باب کا آغاز کیا ہے ساتھ ہی اسلامی محاذ عمل (اردن) کی شکست مشرقِ وسطیٰ کے لئے ایک اچھا اور امید افزا شگون تصور کیا جا رہا ہے۔ نہ صرف شاہ حسین بلکہ کئی دوسرے عرب حکمرانوں کے لئے بھی بنیاد پرستی کے عفریت سے چھٹکارے کی راہ ہموار ہوتی نظر آرہی ہے۔

۳۷ سال کی طویل مدت کے بعد پہلی بار اردن میں سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر سوموار ۸ا نومبر ۱۹۹۳ء کو پارلیمانی انتخابات ہوئے۔ نتائج دو حیثیتوں سے مثبت، انقلابی، دور رس اور بین الاقوامی اہمیت کے حامل رہے۔ اول تو یہ کہ ووٹ دہندگان نے مفاد پرست اخوان المسلمین کے سیاسی بازو، یعنی اسلامی محاذ عمل کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا، چنانچہ انہیں اپنی بہت سے سابقہ نشستوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ مزید براں اسی ارکان کی پارلیمنٹ میں چون نشستیں ان اعتدال پسند آزاد امیدواروں نے حاصل کیں جو امن عالم کی بحالی، ملکی مفاد اور فلسطینی محاذ آزادی کے مستقبل اور آزادی کی خاطر اردن کی اسرائیل کے ساتھ امن کی حکمت عملی کی حمایت کرتے ہیں، چنانچہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس الیکشن کے نتائج ایک

طرف تو بنیاد پرستوں کے لئے فال بد ثابت ہوئے اور دوسری طرف شاہ حسین مشرق وسطیٰ میں قیام امن اور ان عرب ممالک کے لئے، جو بنیاد پرستوں کی یلغار سے بوکھلا اٹھے ہیں اور جنہیں خدشہ ہے کہ یہ عناصر ان کے اپنے ممالک میں بھی اسلام کے نام پر شورش برپا کرنے سے باز نہ آئیں گے، یہ انتخابی نتائج امن کی ضمانت بن کر آئے ہیں۔ دوم یہ کہ اردن کی خواتین کی جنگ آزادی کی کام‌یابی کی بازگشت بھی ان انتخابی نتائج میں سنائی دیتی ہے۔

ویسے تو ۸۰ ارکان پارلیمنٹ میں خواتین کا صرف ایک نشست حاصل کرنا فی صد کے لحاظ سے بہت ہی معمولی نظر آتا ہے، لیکن اردن میں عورتوں کا سیاسی، سماجی پس منظر اور بنیاد پرستوں کے رویہ کے پیش نظر یہ صرف اردن کے لئے ہی نہیں بلکہ بہت سارے عرب ممالک کے لئے عورتوں کے ابھرتے ہوئے سیاسی اور سماجی شعور کے لئے یہ کام‌یابی ایک مثبت انقلابی راہ گذر ہے۔ ۴۴ سالہ تورجن فیصل عورتوں کے حقوق کی علم بردار اور تنظیم حقوق انسانی کی ایک اہم کارکن اور شخصیت ہیں۔ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے صرف تین خواتین بشمول تورجن فیصل، امیدوار تھیں۔ ان تین میں صرف فیصل کام‌یاب ہو سکیں۔ ۱۹۸۹ء میں بارہ خواتین بشمول فیصل نے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ لیکن کوئی کام‌یاب نہ ہو سکی تھیں۔ ۱۹۸۹ء کی ناکامی سے خواتین بہت بد دل ہو گئی تھیں اور اب مرد امیدواروں سے کام‌یاب ٹکر لینا انہیں انہونی سی بات لگتی تھی۔ دوسری چیز، جس نے عورتوں کو سیاسی محاذ آرائی سے دور رکھنے میں اہم کردار ادا کیا، وہ بنیاد پرستوں کا خواتین تحریک کی رہنماؤں کے خلاف جارحانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویہ اور طرز عمل تھا۔ بنیاد پرست ان خواتین کے کردار پر کیچڑ اچھالنے اور ان کی خاندانی زندگی کو تہس نہس کرنے تک کے ہتھکنڈوں کو ان پر عزم عورتوں کے خلاف آزمانے سے باز نہ آتے۔ ۱۹۸۹ء

میں اسلامی بنیاد پرستوں نے فیصل کو مرتد ہونے کا مرتکب ٹھہرا کر ان کا نکاح منسوخ کرانے کے لئے عدالت تک سے رجوع کیا، لیکن فیصل کی ہمت اور عزم کو کوئی سنگ راہ پست یا متزلزل نہ کر پایا۔ اس حوالہ سے دیکھا جائے تو اردن کے رجعت پرست روایتی قسم کے مردوں کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ ایک عورت کو اپنا نمائندہ منتخب کریں، جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، خاص طور پر جبکہ اردن میں تاحال عورتوں کا کوئی خاص سیاسی کردار نہیں ابھر پایا ہے اور پھر اخوان المسلمین تو کھلم کھلا مذہب کی آڑ لے کر پرچار کرتی ہے کہ عورتوں کو پردہ میں رہ کر گھروں میں بند رہنا چاہیے یا بہت سے بہت یہ معلمہ یا نرس کا پیشہ اختیار کر سکتی ہیں۔

اردن کی عورتوں کو ووٹ دینے اور منتخب ہونے کا حق ۱۹۷۴ء میں ملا تھا۔ تب سے دو عورتیں کیبنٹ کی وزیر اور ایک ممبر سینٹ مقرر ہوئیں تھیں۔ اردن میں وزیراعظم کی تقرری شاہ کرتے ہیں اور وزیراعظم اپنی کابینہ کے ارکان کی تقرری کرتا ہے۔ وزیراعظم اور ارکان کابینہ کے لئے منتخب نمائندہ ہونا لازمی نہیں ہے۔ اب تک وہاں کوئی خاتون، سپریم کورٹ کے جج کے عہدہ پر فائز نہیں ہو سکی ہے۔ اب عورتوں نے شاہ کے سامنے خواتین کے لئے پارلیمنٹ میں مخصوص کوٹے کا مطالبہ پیش کیا ہے۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اگرچہ منزل اب بھی بہت دور ہے، لیکن اردن جمہوریت اور عورتوں کی جاگیرتی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے۔

# جنگ افغانستان اور سوویت یونین کا سقوط

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد جب سلطنت برطانیہ، جس کا سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا، اس کا اپنا مقامی سورج ہی گہنانے لگا تو قسمت اور کامیابی کے اس ہرجائی سورج نے امریکا کا رخ کیا، چنانچہ ہم جیسے لوگ جو بچپن سے برطانیہ سے نفرت کا زہر پی پی کر پروان چڑھے تھے، اب امریکا سے وہی نفرت کا رشتہ استوار کر بیٹھے۔ کچھ یاد نہیں کہ یہ اشعار کس کے ہیں، لیکن انگریزوں کی برتری سے انکار کرنے اور ان کی تذلیل و تضحیک کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا اور ثبوت کے طور پر ہم اکثر و بیش تر اپنے ہم عصروں میں ان اشعار کا ورد کرتے تھے:

کہا منصور نے، "خدا ہوں میں"
ڈارون بولا، "بوزنہ ہوں میں"

تو بھلا بندروں سے تعلق رکھنے والی گوری قوم ہم مشرق والوں کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے۔ برطانیہ نے سیاسی غلبہ حاصل کر کے نوآبادیات کا معاشی استحصال کیا۔ امریکا نے قرض اور ہتھیار عطا کر کے پس ماندہ ممالک کو غلام بنایا۔ ساتھ ہی روس اور امریکا میں کرہ ارض کے بانٹ بخرہ کی دوڑ بھی شروع ہوئی کہ سوویت یونین بھی اب امریکا کا برابر کا مدمقابل اور حریف ہو کر ابھرا تھا۔ عام انسان کے حصہ میں بھی بلندی آئی۔ اشیائے صرف کی قیمتوں اور بے روزگاری میں بے حد اضافہ کی شکل میں لاکھوں انسان بے روزگار ہوئے اور بنیادی ضرورت کی چیزوں نے آسمان کی عظمتوں کی رقیب بننے کا کامیاب فیصلہ کر لیا۔ امریکا اور روس دو متضاد عالمی نظام کے علم بردار۔ افریقہ اور ایشیا کے لئے تو قتل و غارت کی ہنگامہ آرائی ہی زندگی اور تواریخ کے سفر کی امین ہے کہ ان میں سے زیادہ تر پس ماندہ ممالک جو ٹھہرے۔ علاوہ بریں دو نکلیائی

دیوتاؤں کے براہ راست آپس میں ٹکرانے کا خدشہ بھی تھا۔ بہرحال یہ خدشہ نفسیاتی ہتھیاروں کے استعمال تک ہی محدود رہا۔ روس اور امریکا خود بھی ایک دوسرے کے عتاب سے خائف رہے۔ دونوں عظیم طاقتوں نے DENTENTE کی باتیں بھی کچھ عرصہ کے لئے کیں۔ اس کا پروپیگنڈا اس انداز میں کیا گیا جیسے یہ DENTENTE بھی ہر دو حریف کے لئے ماں کی شفقت بھری آغوش ثابت ہو گی جہاں ہر دکھ درد دور ہو جائیں گے اور صرف امن عالم اور عوامی خوش حالی کا دور دورہ ہو گا۔ چین نے کھل کر اس DENTENTE کی مخالفت کی۔ چین کی کھلی نکتہ چینی پر دونوں عظیم طاقتوں نے خوب اسے ہدف ملامت بنایا، لیکن جلد ہی یہ بات کھل کر سامنے آگئ کہ امریکا اور روس نے DENTENTE کا شوشہ محض ایک دوسرے کو زیر دکھانے کے لئے چھوڑا تھا ورنہ دونوں ممالک میں سے کوئی بھی DENTENTE کے نام پر اپنے آپ کو کسی طرح پابند کرنے کے لئے تیار نہ تھا، چنانچہ مختصر ترین عرصہ کے لئے جو سرد جنگ میں تعطل پیدا ہوا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ کارٹر نے بہتر حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روس کی محاذ آرائی یا بقائے باہمی، دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کی پیش کش کی۔ ماسکو نے بھی جوابی حملہ دوسری تجویز کے ذریعہ کیا DENTENTE کا شوشہ ختم ہوا۔ سرد جنگ نے دوبارہ پوری گرما گرمی سے کرہ ارض کو لپیٹ میں لے لیا تاوقتیکہ ایک فریق سردی کی اس لپیٹ میں آکر اپنے آپ کو بکھیر نہ بیٹھا۔

وزیراعظم نور محمد تاراکی کی زیر قیادت افغانستان میں جو فوجی انقلاب آیا، اسے روس اور روسی کیمونزم کے زیر اثر ساری کیمونسٹ پارٹیوں اور ممالک نے خوش آمدید کہا۔ تاراکی، امین اور کارمل تینوں یکے بعد دیگرے بائیں تحریک کی نمائندگی کرتے رہے اور باہمی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کی جڑیں کھودتے رہے۔ امریکا

اور ساتھ ہی امریکا کے پیارے اور قابل اعتماد ہونے کے ناتے پاکستان نے بھی بائیں بازو کی ترقی پسند حکومتوں کو قدم جمانے سے پہلے ہی جنگی اور مذہبی بنیاد پرستی کے ہتھیاروں سے اتنا مسلح کر دیا کہ آج افغانستان کا جو حشر ہو رہا ہے، وہ سامنے ہے ہم لوگوں کے ذہنوں میں "کابلی والے" کے دیش کے بارے میں جو امیج تھا، وہ اتنا بے حقیقت ثابت ہو گا، اس کا اندازہ نہ تھا۔ ہم روسی کمیونزم کے پرستار تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ افغانستان ۲۱ویں صدی کو ایک نئی کمیونسٹ طاقت کی حیثیت سے خوش آمدید کہے گا۔ جہاد کا نظریہ اتنا مسخ کر کے افغان مجاہدین کے ذہنوں میں بٹھایا گیا کہ ان کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو گئیں۔ صرف جنگی جبلت باقی رہ گئی۔ اب یہ ہے کہ ملک و قوم کی ترقی اور خوش حالی کی ساری راہیں مذہب کے نام پر مسدود کر کے مختلف جنگ جو گروپ ایک دوسرے کی قیمت پر حاکمیت کا عہدہ اور غازیت کا درجہ پانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ مبارک ہو امریکا اور پاکستان کو افغانستان کی یہ تباہی۔

یہ کہنا کہ افغانستان میں حقیقتاً کوئی بامعنی انقلاب آیا تھا کہ نہیں، بہت مشکل اور متنازعہ مسئلہ ہے، لیکن ایک بات طے ہے کہ ثور انقلاب کے اقتدار نے بین الاقوامی سطح پر وسطی ایشیا میں بڑی طاقتوں کے اثر کے توازن کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ ۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی کے اوائل میں یہ ملک روس کے زار شاہی اور مملکت برطانیہ کے زیر سایہ ہندوستان کی کشمکش کا اکھاڑا رہا تھا اور اقتدار کی یہی رقابت ۱۹ ویں صدی میں برطانیہ اور افغانستان کے درمیان دو جنگوں کا سبب بنی تھی، لیکن روس یا برطانیہ میں سے کوئی بھی واقعتاً بہت دنوں تک نڈر افغانوں پر حاوی نہ ہو پایا۔ افغان حکمران رفتہ رفتہ یہ گر سیکھ گئے کہ دونوں طاقتوں کی رقابت سے فائدہ اٹھا کر ملک کا نہ سہی، پر افغانستان کے شاہی خاندان کا مفاد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ

کھیل جنگ عظیم دوم کے خاتمہ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ پھر میدان کے اصل کھلاڑی روس اور امریکا رزم گاہ اثر و رسوخ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی میں جٹ گئے۔ سویت یونین نے افغانستان کی فوج کی تنظیم و تربیت پر کثیر رقم خرچ کرنے کے علاوہ ایک بڑی رقم فوجی اور ترقیاتی منصوبوں کی مہم پر خرچ کرنے کے لئے دی۔ بھلا امریکا کیسے پیچھے رہ سکتا تھا، سو ریاست ہائے متحدہ امریکا نے بھی روس کے سیاسی اثر و رسوخ پر حد بندی کرنے کے لئے معاشی امداد کے طور پر خاصی رقم عطا کی۔ ویسے اپنے وقت میں کابل کی بائیں بازو کی حکومتوں نے کارٹر کی انتظامیہ کے لئے خاصی الجھن کا سامان پیدا کر دیا تھا۔

پاکستان نے یہ آس لگائی تھی کہ افغانستان میں سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا خوف امریکا کو مجبور کر دے گا کہ وہ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ ہر طرح کی امداد سے نوازے۔ ہندوستان کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ امریکا کی طرف سے پاکستان کو ہتھیاروں کی فراہمی اس خطہ میں فوجی طاقت کے توازن کو اتھل پتھل کر دے گی۔ ایران کو امید تھی کہ کابل کے انقلاب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ امریکا سے مزید مراعات حاصل کر سکے گا، لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا، کیونکہ افغانستان کے لوگوں کو پس ماندگی سے ترقی کی راہ راس نہ آئی اور وہ آپس ہی میں کٹ مر کر شہید اور غازی بننے کی راہ پر چل پڑے ہیں۔ تھیسس اور انٹیتھیسس ہی سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو سنتھیسس کی پیشینگوئی کیسے ہو؟

سائنسی انکشافات و ایجادات، جمہوری حکومتیں، انسانی حقوق کے ادارے، اقوام متحدہ، مذہبی بنیاد پرستی کا احیا وغیرہ وغیرہ کے باوجود آج کی دنیا میں ہمیشہ سے زیادہ امن، آزادی اور حقوق انسانی کا فقدان ہے۔ گذشتہ پانچ، چھ دہائیوں سے، یعنی تقریباً دوسری جنگ عظیم سے لے کر اب تک، ہم ۲ عظیم طاقتوں کے درمیان

سرد جنگ کی تلوار کے زیر سایہ رہے ۔ سوویت یونین اور امریکا اپنے اپنے مفاد کی خاطر مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا وغیرہ کے علاقوں میں ایک دوسرے کی طاقت اور اثر سے خائف ایک محفوظ حد تک زبانی دھمکیوں اور اپنی اپنی حکمت عملیوں کی مدد سے آپس میں ٹکراتے رہے اور عام لوگ اور ممالک اپنی بساط بھر اور اپنے اپنے نظریات اور صلاحیتوں کے مطابق ایک یا دوسری طاقت کو مورد الزام ٹھہراتے رہے ۔ جب سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہوا تو امریکا اور اس کے حریف ممالک کے علاوہ انفرادی طور پر ان لوگوں نے، جو مارکسزم سے محض اس کے سیکولر ہونے کی بنا پر خار کھاتے رہے ہیں، خوب بغلیں بجائیں، فتح و شادمانی کے جشن منائے اس خوش فہمی اور دعویٰ کے ساتھ کہ اب سوویت یونین کی ناکامی کے بعد دیگر تنگ نظر اور متعصب نظریات کو بلامقابلہ پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا ۔ سوویت یونین میں ایک تجربہ کیا سازشوں اور کم فہمیوں کی بھینٹ چڑھا کہ بنیاد پرستوں کے لئے پورے سائنٹفک نظریہ اور فلسفہ کی اساس ہی ختم ہو گئی ۔ انہیں حلقوں سے یہ بھی پروپیگنڈا اور پیشینگوئی کی جانے لگی کہ اب مارکسزم کا فلسفہ اور اس پر عمل کی راہیں ہمیشہ کے لئے مسدود ہو گئیں ۔

حادثہ کہیئے، سانحہ یا ٹریجڈی، مگر ہمارے جیسے لوگوں نے، جو سوویت یونین سے نظریات کے ساتھ جذباتی طور پر بھی وابستہ تھے، عقلی کم لیکن جذباتی اثر زیادہ لیا ان گنت سیمینار اور کانفرنسیں ہوئیں اور یہ سب صرف دل کے بہلانے اور اپنے آپ کو یہ اعتماد دلانے کے لئے تھا کہ سوویت یونین ختم نہیں ہوا ہے، ہم سیاسی اثر و رسوخ اور نظریاتی طور پر تقسیم نہیں ہوئے ہیں اور سوویت یونین جس آزمائش سے گذر رہا ہے، وہ عین مارکس کی تعلیمات اور پیشینگوئی کے مطابق ہے ۔

۱۹۸۹ء میں دیوار برلن گرائی گئی ۔ مشرقی یورپ میں کمیونسٹ حکومتوں کی

گرفت ڈھیلی پڑنے لگی ۔ گوربچوف کی نام نہاد سیاسی اصلاحات کے ساتھ حریف طاقتوں کا تعاون بھی بڑھتا گیا اور عالمی سطح پر حالات کے بہتر ہونے کا پروپیگنڈا بھی ۔ لیکن ہوا یہ کہ سوویت یونین کے زوال اور سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد عالمی مسائل اور کشمکش سلجھنے کی بجائے روز بروز زیادہ پیچیدہ اور سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں ۔ "اب دنیا دو برسرپیکار بلاک میں منقسم ہے ۔ نہ دو متضاد نظریات برسر اقتدار ہیں ، نہ دو سپر عالمی طاقتوں کا وجود ہے ۔ لیکن بھلا کہیں تواریخ کے قدموں کو بھی پا بسلاسل کیا جا سکا ہے ۔ روایتی مفہوم کے لحاظ سے غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنا سعی لاحاصل سہی ، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جب تک معاشرہ میں طبقات حاکم اور محکوم کی حیثیت سے رہیں گے ، امن ، آزادی ، رواداری اور انصاف ، جس کا دعویٰ ہر حکم ران طبقہ کرتا ہے اور جس کی دہائی ہر مظلوم طبقہ دیتا ہے ، دیوانے کا خواب ہی رہے گا ۔

مارکسزم اور سوویت یونین ، غیر طبقاتی معاشرہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ کر سکے اور میدان سے علیحدہ ہونا پڑا ۔ اس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ، ریاست اور تواریخ خط مستقیم کی مانند ایک سیدھ میں اپنے نقطہ آغاز سے نقطہ اختتام تک سفر نہیں کرتے ۔ تواریخ انسانی عمل سے بنتی ہے اور انسان کا دماغ بڑا پرپیچ اور اس کے اعمال اکثر متضاد ہوتے ہیں جن کی نہ تو وضاحت کی جا سکتی ہے نہ پیشینگوئی ، چنانچہ جدلی مادیت ، پرولتاری ڈکٹیٹر شپ ، غیر طبقاتی معاشرے اور پھر ریاست کا تاریخی خاتمہ وغیرہ مارکسی تواریخی سفر کی وہ متعین شدہ راہیں تھیں جن پر ہم جیسے لوگوں نے آنکھ بند کر کے بھروسا کر لیا تھا اور کبھی بھی عقلی اور منطقی دلائل کی روشنی میں ان کے عملی امکان کا جائزہ نہیں لیا تھا ۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے کہ جیسے مذہب کے ملا ایک طرف تو کلام پاک کے نام پر یہ پرچار کرتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں اور مردوں کو مساوی حیثیت اور مساوی حقوق حاصل ہیں جبکہ کلام پاک

کی ان کی اپنی تفسیر کے مطابق عورت کی حیثیت ضمنی انسان کی ہے۔ اب کوئی مسلمان خود سے قرآن شریف پڑھ کر اللہ کے کلام اور احکام کو سمجھنے اور ان سے صحیح مفہوم اخذ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا کہ ملاؤں نے اجتہاد ختم کر دیا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس جسارت پر ہتک اسلام کا فتویٰ صادر کر دیا جائے۔ بالکل اسی طرح مارکس کے تشریح و تفسیر کرنے والے افراد نے (جن میں لینن اور اسٹالن کا نام سرفہرست آتا ہے) مارکس اینجل کو سمجھنے سمجھانے کا سارا بیڑا خود اٹھالیا تھا۔ جس نے سرمو ان کے خیالات سے اختلاف کیا، وہ ترمیم پرست، رجعت پرست اور مارکس کے فلسفہ کا مرتد ٹھہرایا گیا۔

اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے اثر نے روسی کیمونسٹوں کو اس غلط فہمی میں بھی مبتلا کر دیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کمزور پڑ رہا ہے۔ اس حقیقت کا وہ اندازہ نہ کر سکے کہ ایک نئے نظام (مارکسزم) کا سرمایہ دارانہ نظام سے کھلی منڈی میں مقابلہ تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کمزور نہیں پڑ رہا تھا بلکہ اپنے سارے اندرونی تضادات کو اپنے اندر سمو کر مائل بہ عروج تھا اور اب بھی ہے جبکہ سوویت یونین کی کوشش ہر تضاد اور مخالفت کو بزور ریاست کچل دینے کی تھی کہ ان کے نزدیک پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے ہاتھوں ریاست کا تواریخی فریضہ یہی بنتا تھا۔

جب کوئی نظریہ، جس پر مذہبی کٹر پرستوں سے بھی بڑھ کر اندھا اعتقاد رہا ہو اچانک حقائق کے تھپیڑوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے اور ہم بے بسی کے عالم میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ اپنی زندگی کے بہترین سال لٹا کر ہمیں صرف چند برسوں کے لئے احمقوں کی جنت ملی تھی تو پھر اپنے آپ کو معاف کر دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ہماری نسل کے دوسرے لوگ، جو ہماری طرح مارکس اینجل لینن کی مثلث پر عقیدہ سے بھی بڑھ کر اعتقاد رکھتے تھے اور ساری زندگی اور زندگی کے حسین

خواب اس عقیدہ کے حوالہ کر دیئے تھے، سوویت طرز کے کمیونزم کے زوال سے یقیناً بکھر کر رہ گئے ہیں۔ برسراقتدار آنے کے بعد سے اپنی موت تک، اسٹالن نے اپنے مخالفین پر ظلم و تشدد کی غیر انسانی حد تک انتہا کر دی۔ اس وقت آہنی دیوار کے پس پردہ کیا ہو رہا ہے، اسے ہم امریکا کا مخالفانہ پروپیگنڈا سمجھتے تھے اور خود اس پر ایمان رکھتے تھے۔ پرولتاری ڈکٹیٹرشپ سے برتر نہ تو جمہوریت کا شعور ہو سکتا ہے، نہ جمہوری نظام اور سوویت نظام اور اسٹالن کی زیر قیادت بربریت کا مافیا پیٹتا رہا۔

## شاہ بانو کا مشہور زمانہ کیس

اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ کیا میری شخصیت میں نظریاتی تضاد ہے، کیا میں رجعت پرست ہوں، کیا میں خواتین کے مساوات کی تحریک کی مخالف ہوں، کیا مجھے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور اختراعات پسند نہیں؟ وجہ یہ ہے کہ ان سوالات پر میری سوچ عام ڈگر سے ذرا ہٹ کر ہے۔ کاش مجھ میں نظریاتی تضاد ہوتا تو میری گہری وابستگی مارکسزم اور کمیونزم سے نہ ہوتی! اگر کبھی تھی بھی تو اب سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد تو کم از کم نہ رہتی کہ پہلے تو ہزار سخت ہی جدوجہد کی راہ، لیکن سراب منزل تو تھا۔ اب تو منزل کے نشان کے بغیر کبھی ختم نہ ہونے والی کرب اور بے یقینی کی رہ گذر ہے۔ یہ درست ہے کہ مجھے اپنے ماضی سے یہ شکوہ ہے کہ میں نے آنکھ بند کر کے، عقل اور دلیل سے کام لئے بغیر پارٹی کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دیا لیکن اپنی ذہنی و نظریاتی اساس سے نہ کبھی پہلے سمجھوتا کیا تھا نہ اب۔ پہلے اپنے آپ پر اعتماد کی کمی کے باعث کبھی لینن اسٹالن کی مارکس کی تشریحات اور حکمت عملی سے شکوک و شبہات کے باوجود اظہار اختلاف کی ہمت نہ کر سکی اور آج جب بائیں بازو کی کسی لیڈرشپ سے وفاداری کا کوئی معاہدہ نہیں ہے، مارکس کا وہ نظریہ اسی طرح

رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے جیسے کبھی تھا۔ کوئی اور نظریہ چھتا ہی نہیں ہے کم از کم مارکسزم کی طاقت پر سیکولر اور انسانی حقوق کی علم برداری تو ہو سکتی ہے، انسان اور انصاف سے محبت تو کی جا سکتی ہے۔

ویسے تو ہر انسان ہمہ وقت اپنے گرد و پیش، ماحول اور حالات سے شعوری اور غیر شعوری طور پر اثر لیتا ہے، اسی لئے تو کہتے ہیں کہ آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ سو خود اپنے بارے میں، میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ مہد سے لے کر تا دم تحریر جس ماحول میں مجھے رہنا پڑا جن لوگوں سے میرا واسطہ پڑا اور جن مسائل سے مجھے نپٹنا پڑا، ان سب کا مختصراً جائزہ میں نے اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور میری پوری عملی اور نظریاتی شخصیت اسی پس منظر کی مرہون منت ہے۔ بہرحال ماحول اور گرد و پیش سے غیر شعوری طور پر متاثر ہونا لازمی تو ہے، لیکن مجھے اس اعتراف میں مزہ نہیں آتا۔

اکثر جب بوریت ہو رہی ہو یا بین الاقوامی اور قومی سطح پر حالات بڑے مایوس کن نقشہ پیش کرتے ہیں تو ماضی کی وسعتوں میں کھو کر یہ سوچنے میں بڑا مزہ آتا ہے کہ عام طرز سے ہٹ کر سوچنے اور عمل کرنے کے لئے کون سا محرک تھا جس نے شعوری طور پر مجھے ہر اس روایت، تصور اور فلسفہ سے باغی بنا دیا جس میں عورت اور مرد کو انصاف، انسانی معیار اور انسانی حقوق کی یکساں ترازو پر نہ تولا گیا ہو۔ سب سے پہلا نام نیاز فتح پوری کا آتا ہے۔ ان کا رسالہ "نگار" میں نے اس وقت سے پڑھنا شروع کیا تھا جب ان کی معرب اور مفرس تحریر میں صرف چند اردو کے الفاظ ہی سمجھ میں آتے تھے۔ مجھے صحیح سن یاد نہیں ہے۔ میری عمر غالباً ۱۲، ۱۳ سال کی ہو گی۔ نیاز صاحب کا ایک مضمون "نگار" میں پڑھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ موجودہ اسلامی فقہ کی رو سے عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں بہت کم حقوق ملے

ہوئے ہیں ۔ اور بھی بہت ساری باتیں اس مضمون میں تھیں جن کا احاطہ کرنا ابھی بہت مشکل ہے کہ اول تو رسالہ " نگار " کی وہ کاپی میرے پیش نظر نہیں ہے اور گو حافظہ کی لوح پر بہت کچھ محفوظ ہے، لیکن مصلحتیں آڑے آرہی ہیں کہ ان کو بیان نہ کیا جائے ۔ بہرحال ہوا یہ کہ اس مضمون کے پڑھتے ہی جو اللہ میاں سے شکوہ کا رشتہ پیدا ہوا، سو آج تک استوار ہی ہوتا چلا گیا کہ جواب شکوہ ابھی تک موصول نہیں ہوا

دوسرا نام مارکس کا آتا ہے جس کا کمیونسٹ مینیفیسٹو پڑھ کر مجھے مارکسزم پر ایسا اعتماد اور بھروسا ہوا جو آج تک ہزار اختلافات کے باوجود بھی اپنی پہلی سی آن بان کے ساتھ قائم ہے ۔ نیاز فتح پوری نے مجھے عورت کے حقوق کا حوالہ دے کر جیت لیا (یا گم راہ کر دیا) اور مارکس نے قدر زائد کے حوالہ سے جنم جنم کے لئے اپنے فلسفہ کا گرویدہ بنا لیا ۔ باقی سارے اثرات تو ضمنی ہوئے ۔ ارے ہاں ! اور میری شخصیت اور خیالات کو بگاڑنے یا سدھارنے میں عظیم بیگ چغتائی کچھ پیچھے تھوڑا رہے ہیں ۔ ان کی ساری کتابیں میں نے بچپن ہی میں پڑھی تھیں ۔ ایک بار نہیں بار بار " گولستار " انگوٹھی کی مصیبت اور باقی ساری دوسری کتابیں پڑھتی اور سنتی ، سنتی اور پڑھتی تھی ۔ بس انہیں ایک مزاحیہ افسانہ نگار سمجھتی اور تب ان کی کتاب " تفویض " ہاتھ لگی ۔ اس ناپختہ عمر میں " تفویض " سے ذہن نے بڑے باغیانہ (ترمیمی یا مصلحانہ) اثرات قبول کئے ۔ تفویض کا انداز تحریر مزاحیہ اور طنزیہ تو تھا ہی جو عظیم بیگ کی اپنی انفرادیت رکھتی تھی ، لیکن اصل میں عورت کی بے بسی کے ناتے ایسے ناسور پر نشتر لگایا گیا تھا جس کی تڑپ میں نے ہر ظلم اور زیادتی سے زیادہ محسوس کی اور تب بھی شکوہ اللہ میاں ہی سے ہوا ۔ بھلا عورت بناتے ہی حوا سے گناہ کیوں کرا دیا جس کا سہارا لے کر کٹھ ملا الٹی سیدھی تاویلیں کرتے رہتے ہیں ، چنانچہ مجھے صحبت تو کبھی غلط نہ ملی لیکن صحیح کتابیں ضرور غلط عمر میں مل گئیں ۔ " بہشتی زیور " گھر میں تھی اور

طاقچہ پر بڑی حفاظت سے رکھی جاتی تھی۔ اپنے بڑوں سے اس کی بہت بڑائی بھی سنتی رہتی تھی اور یہ کہ یہ لڑکیوں کے جہیز میں دی جاتی ہے، لیکن جب بھی اس جہیز کو باقاعدہ ملنے سے پہلے اٹھا کر پڑھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا کہ اماں نے جھڑک دیا،

"کیا کرو گی ابھی سے بہشتی زیور پڑھ کر۔ تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔"

اور میری سمجھ میں یہ بات نہ آئے کہ آخر قرآن شریف بھی تو میری سمجھ میں نہیں آتا ہے تو کیوں اماں اتنی محنت کر کے سبق اور آموختہ رٹواتی ہیں اور ابا اس کی تفسیر اور تشریح سمجھاتے رہتے ہیں۔ یہ انہیں دنوں کی بات ہے جب مجھے نیاز فتح پوری صاحب کا "نگار" کمیونسٹ مینیفیسٹو عظیم بیگ چغتائی کی کتاب "تفویض" ہاتھ لگی۔ ان کتابوں کے پڑھنے پر اماں نے کبھی کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ خوش ہوتی رہیں کہ بیٹی پڑھنے کی بہت شوقین نکلی۔

اسی کتاب میں، میں نے "فیمنزم کا مستقبل موجودہ دہائی سے آگے" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنے ہم خیالوں میں مجھے اس نقطہ نظر کی بدولت رجعت پرست سمجھا جاتا ہے۔ میرے دوست اور میرے ہی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے کامریڈ کہتے ہیں کہ میں خواتین کی مساوات کے خلاف ہوں۔ یہ رویہ مارکسزم کے خلاف ہے اور میری شخصیت میں نظریاتی تضاد ہے۔

شاہ بانو کے مشہور زمانہ کیس کے زمانہ میں، میں انڈیا میں تھی۔ میرے سبھی کامریڈ، بشمول کمیونسٹ پارٹی، کی لائن یہ تھی کہ شاہ بانو کو اپنے سابقہ شوہر سے گذارہ الاونس ملنا انصاف کا تقاضا اور مارکسزم کی کڑی ہے۔ میرے خیال میں شادی ٹوٹنے کے بعد سابقہ شوہر سے گذارا لینا خاص مجبوری کے تحت تو جائز ہو سکتا ہے، لیکن معاشرہ میں عورت کے وقار اور مساوی حیثیت کی جدوجہد کے لئے سم قاتل ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں میں یہ احساس کم تری پیدا کرنے کا باعث ہے کہ وہ مرد کی

مالی اعانت کے بغیر نہیں رہ سکتیں ۔ بہرحال خوب خوب مجھ پر میرے نظریاتی دوستوں نے نکتہ چینی کی ۔ اتنا ہی نہیں مجھے تو کیمونسٹ انقلابی اور نجات یافتہ خاتون ہونے کے باوجود بھی موجودہ فیمنسٹوں سے سخت اختلاف ہے ۔ ویسے مجھے یہ زعم بھی ہے کہ عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق اور منصب کی علم بردار میں ہوش سنبھلنے سے پہلے ہی سے چلی آرہی ہوں، یعنی یہ علت میری گھٹی میں پڑی ہے فیمنسٹوں سے ٹکراؤ اس لئے ہے کہ میرے خیال میں عورتوں کو شدید احساس کم تری میں مبتلا ہو کر اپنے جنڈر سے شرمندہ ہونے کی بجائے اسی طرح فخر کرنا چاہیئے جیسے مرد اپنے مرد ہونے پر فخر کرتا ہے ۔ مساوات کا مطلب اگر یکسانیت ہے تو پھر اپنی بائلوجی سے چھٹکارا لازمی ہو جاتا ہے جو عملاً ممکن نہیں ۔

جن وجوہات کی بنا پر شاہ بانو کے کیس میں گذارہ الاؤنس کے میں خلاف تھی انہیں کی بنا پر لڑکیوں کو جہیز دینے کے بھی میں مخالف ہوں ۔

لڑکیوں کو شادی کے وقت جہیز دینے کی رسم سے مجھے خاندانی طور پر الرجی رہی ۔ اس کی وجہ بھی وہ ماحول تھا جو ہمیں اپنے گھر میں ملا ۔ یہ رسم زمانہ دراز سے چلی آرہی ہے اور عام تاثر یہ ہے کہ یہ لعنت پہلے بھی اور آج بھی صرف برصغیر تک ہی محدود ہے اور رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہیز کی رسم ہمیشہ سے لعنت نہیں تھی بلکہ اس کا زبردست مثبت پہلو تھا اور اب یہ تجزیہ کرنا ہے کہ جہیز کی لعنت کو آج قائم و دائم رکھنے کے ذمہ دار کون سے عوامل و عناصر ہیں ۔ ان عوامل کی صحیح معنوں میں نشان دہی کئے بغیر جہیز کی قربان گاہ پر ان گنت عورتیں بھینٹ تو چڑھ سکتی ہیں، مگر اس خون پینے والے دیوتا کی بیخ کنی نہیں ہو سکتی ۔

آج ایک طرف تو عورتوں کی جنگ آزادی و مساوات اپنی منزل مقصود کی اس انتہا تک پہنچ گئی ہے جہاں سے عورتوں اور مردوں کے مشترکہ فلاح انسانیت

کی جدوجہد کی حد شروع ہونا چاہیئے ، لیکن ابھی تم ستی ، عورت کو بڑھاپے میں طلاق کی صورت میں گذارہ الاؤنس کا حق ۔ جہیز اور مناسب جہیز نہ ملنے کی صورت میں اس کے ساتھ بدسلوکی ، عورتوں کی دنیا گھر کی چہار دیواری تک محدود ہے یا اسے بھی حسب صلاحیت کائنات کے ذرہ ذرہ کو تسخیر کرنے کے لئے ستاروں تک کمندیں پھینکنے کا حق حاصل ہے ، جیسے سوالات میں الجھے ہوئے ہیں ۔ سوالات اور مسائل کی تو بھرمار ہے ، سو واپس آتے ہیں جہیز کے مسئلہ پر ۔

یہ بات شاید کچھ لوگوں کو چونکا دے ، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے یورپ میں بھی جہیز کا چلن رائج تھا PATRICIA BRONKA اپنی کتاب "WOMEN IN EUROPE SINCE 1750" میں اس دور میں عورتوں کے سماجی مرتبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

"جدید یورپ کے ابتدائی دور میں صرف انہیں عورتوں کی شادی ہو سکتی تھی جن کے والدین ان کے لئے خاطر خواہ جہیز کا بندوبست کر سکتے تھے ۔"

اس دور کے یورپ میں لڑکیوں کو والدین کی جائداد میں وراثت کا حق نہیں حاصل تھا ۔ لازماً ایسے بر کی تلاش ہوتی تھی جو اچھی طرح ان کی کفالت کر سکے ۔ لڑکے بھی ساری عمر روٹی کپڑا مہیا کرنے کی ذمہ داری کے عوض ایسی بیوی لانا چاہتے تھے جو ڈھیروں جہیز لائے ۔

PATRICIA BRONKA نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے :

" عورتوں کی شادی عموماً پختہ عمر، یعنی ۲۵ سے ۲۸ سال، سے پہلے نہیں ہوتی تھی ۔ وجہ یہ تھی کہ متوسط گھرانوں میں چونکہ والدین کو بھاری جہیز مہیا کرنے میں دشواری ہوتی تھی ، اس لئے

اچھی خاصی عمر تک عورتیں جہیز کے انتظار میں کنواری بیٹھی رہتی تھیں۔"

یورپ میں بھی کسی زمانہ میں جہیز کا چلن تھا اور لڑکوں کی جانب سے اس کا مطالبہ بھی ہوتا تھا۔ یہ تذکرہ میں نے اس لئے نہیں کیا ہے اپنے معاشرہ کے اس ناسور کو آج کے ترقی یافتہ ممالک کی مثال سے حق بجانب ٹھہرایا جائے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ہم یورپ والوں سے اس معاملہ میں سبق لیں۔ صنعتی انقلاب کے کہیں بعد یعنی ۲۰ ویں صدی کے آغاز تک فرانس کے شہروں اور دیہاتوں کے صاحب حیثیت خاندانوں میں جہیز کا لین دین ہوتا تھا۔ اکثر بار تو شادی کو اہم مالی معاہدہ کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ اس معاہدہ میں جہیز کے متعلق ساری تفصیلات درج ہوتیں۔ کبھی کبھی تو معاہدہ کے ذریعہ یہ بھی طے کر لیا جاتا تھا کہ لڑکی کو ملے ہوئے جہیز پر شوہر کو مکمل اختیار رہے گا، چنانچہ یہ دعویٰ کرنا غلط نہ ہوگا کہ پہلے زمانہ میں برصغیر میں جو جہیز کا لین دین ہوا کرتا تھا، وہ اس دور کی سماجی ضرورت تھی اور عورتوں کے حق میں ایک نعمت۔ اس زمانہ میں لڑکیوں کو خانداں کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا اور جہیز کی شکل میں اس ناانصافی کا ایک حد تک ازالہ ہو جاتا تھا۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جہیز میں ملی ہوئی رقم، زیور وغیرہ عورت کی ذاتی ملکیت۔ یعنی استری دھن ہوتی تھی اور اس پر شوہر یا سسرال والوں کا حق نہ ہوتا تھا۔

## جہیز ــــــ سماجی لعنت

عورتوں کی آزادی کی تحریک نے ہندو پاک میں خصوصاً صدیوں کی مسافت طے کر لی ہے۔ لیکن اگر راہ میں قدم جم کر رہ گئے ہیں تو صرف ایک سنگ ریزہ کی

بدولت اور وہ سنگ ریزہ ہے جہیز لینے اور دینے کا سارا تصور، عمل اور رسم۔

انسانی معاشرہ وجود میں آنے لگا تو بہت سارے مشترکہ نوعیت کے طرز عمل نے حالات کے مطالبوں کے پیش نظر جنم لیا۔ جنہوں نے آہستہ آہستہ رسم و رواج، روایات اور اکثر عقیدوں کی حیثیت اختیار کر لی۔ تمدن اور طرز معاشرت کے ساتھ ہی رسم و رواج میں تبدیلی ناگزیر ٹھہری ساتھ ہی نئی اقدار کا جنم لازمی، چنانچہ یورپ میں جیسے جیسے عورتیں آزادی حقوق، مساوات، تعلیم اور معاشی خود اعتمادی کی برکتوں سے مستفیض ہوتی گئیں، جہیز لینے دینے کا رائج الوقت طریقہ خود بخود معدوم ہوتا گیا۔ وہاں مساوی حقوق کی خاطر عورتوں نے بہت سارے جہاد کئے، لیکن جہیز کی رسم کے خاتمہ کے لئے کسی خارجی اور شعوری کوشش کی ضرورت پیش نہ آئی کہ جہیز کی رسم کو زندہ رکھنے کے لئے خود عورتیں ہی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ آج یورپ کے سارے ہی ممالک میں یہ حال ہے کہ نئی نسل اگر جہیز کے نام سے واقف بھی ہے تو عہد جاہلیت کی یادگار کے طور پر۔

آج یورپ تو اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کر گیا ہے، لیکن ہند و پاک میں بہت ساری سماجی اور انقلابی تبدیلیوں کے باوجود جہیز کے لین دین نے ایک مہلک وبا کی شکل اختیار کر لی ہے اور ان گنت لڑکیاں اور عورتیں بلکہ خاندان اس کے پیچھے تباہ ہو رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

ایک متضاد حقیقت جس سے جہیز کے حوالہ سے واسطہ پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ جہیز کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہونے کے باوجود عملی طور پر بہت کم والدین یا شادی کی امیدوار لڑکیاں یہ پسند کرتی ہیں کہ ان کی شادی جہیز کے بغیر ہو جائے۔ یہ ایک نفسیاتی معما (DILEMMA) بن کر رہ گیا ہے جس کا متوسط طبقہ کے والدین اور لڑکیاں شکار ہو رہی ہیں۔ حیثیت نہیں ہے مگر جہیز حیثیت سے بڑھ کر دیں گے۔

اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے اور اکثر سے زیادہ بار ہوتا ہے کہ لڑکے والے اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ۔

شادی کے وقت جہیز نہیں چاہیئے۔ لیکن لڑکی والے بضد ہیں کہ ان کی بیٹی ننگی بوچی سسرال کیوں جائے گی۔ اس انداز فکر کو ہم ایسا سماجی دباؤ کہہ سکتے ہیں جو برضا و رغبت ہی نہیں بلکہ فخریہ اپنایا جاتا ہے۔ نمائش اور سطحی نام و نمود اور اپنے رشتہ داروں اور دوستوں پر سبقت لے جانے کی خاطر جن کے پاس ہے، وہ بھی اور جن کے پاس نہیں ہے، وہ بھی اعلیٰ سے اعلیٰ جہیز دینے کے در پے رہتے ہیں۔

ایک اور دقت جو اس بوجھ سے چھٹکارا پانے کی راہ میں پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ لڑکی والے اپنی مالی استطاعت اور سماجی پوزیشن کے برخلاف دولت اور سماجی حیثیت کے لحاظ سے اعلیٰ سے اعلیٰ بر اپنی بیٹی کے لئے تلاش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جب ایک فریق مادی اور مالی فضائل کے پیچھے بھاگے گا تو دوسرا فریق لڑکی کے جہیز کو اہمیت دے گا۔ اگر لڑکی والے خواہاں ہیں کہ ان کی گدڑی کے لال بیٹی کو جہیز کی ترازو پر نہ تولا جائے تو حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں لڑکا بھی گدڑی کا لال ہی ڈھونڈنا چاہیئے۔

جہیز سے چھٹکارا حاصل کرنے میں دوسرا پرابلم نفسیاتی دباؤ کا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ لڑکیاں خود یہ چاہتی ہیں کہ انہیں ڈھیروں جہیز ملے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لڑکیاں تعلیم ختم کر کے برسوں نوکری کرتی ہیں اور ڈھلتی عمر تک اپنا شان دار جہیز تیار کرتی رہتی ہیں۔ نفسیاتی دباؤ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں کو احساس مظلومی میں لذت ملتی ہے۔ تعلیم یافتہ اور معاشی میدان میں سرگرم عمل عورتوں کو بھی یہ کہنے، سننے اور شکوہ کرنے سے طمانیت ملتی ہے کہ وہ جہیز کے لالچی مردوں کی ہوس جہیز کا شکار ہیں اور یہ کہ شادی کے بازار میں ان کی صحیح

قیمت اس لئے نہیں لگ رہی ہے کہ ان کے پاس بھاری جہیز نہیں ہے۔

جہیز کی تواریخ اور سماجی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ جب عورت واقعی کم زور، لاچار اور خاندانی وراثت سے محروم ہوتی تھی تب بے شک جہیز کی ضرورت تھی۔ بلاشبہ اس وقت کے معاشرتی ڈھانچے کا یہی تقاضا تھا۔ مغرب میں عورتوں نے معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی کے ساتھ ہی جہیز کو لایعنی قرار دے کر رد کر دیا۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں مغرب نے مشرق سے بازی جیت لی۔

جہیز پر اتنی باتیں ہو گئیں تو پاکستانی شادی کا بیان ہو ہی جائے جو کناڈا میں جہیز کے رستے ہوئے ناسور کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے ہوئی۔

بلاوا تین دنوں کا تھا، مایوں، مہندی ایک دن۔ دوسرے روز بارات، تیسرے روز دعوت ولیمہ۔ مجھے خیال آیا کہ ہم لوگ تو پاکستان میں اپنے آپ کو لعن طعن کرتے نہیں تھکتے کہ آج کے ٹکنالوجی کے دور میں بھی ہم لوگوں کے پاس اتنا زیادہ وقت ہے کہ مدعوئین ایک شادی کی فکر میں تین شامیں برباد کرتے ہیں اور شادی والے گھر کے لوگوں کی ہفتوں مہینوں کی مصروفیات الگ رہیں، لیکن یہ کینیڈین پاکستانیوں کو کیا سوجھی کہ ترک وطن کے طفیل عزیز و اقارب، خوب صورت تعمیری روایات، عادات و اطوار، تہذیبی اور اخلاقی اقدار تو بخوشی پیچھے چھوڑ آئے، پھر مہندی، مایوں جیسی رسموں کو کیوں کلیجے سے لگا رکھا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ان بےچاروں کو دیار غیر میں اپنا تشخص برقرار رکھنے کے علاوہ جذباتی آسودگی انہیں رسومات کو برت اور محفوظ رکھ کر حاصل ہو جاتی ہے تو کیا برائی ہے۔ عزیز و اقارب سے تو بے چارے چھوٹ ہی چکے ہیں، اب ان سماجی برائیوں سے کیا دامن چھڑانا جن سے اپنے ملک میں ہمہ وقت بیزار رہتے تھے۔

فنکشن ایک کمیونٹی ہال میں تھا جو روشنیوں اور رنگین جھنڈیوں سے جگمگا رہا

تھا ۔ ابھی میں مبہوت سی اندر داخل ہی ہوئی تھی کہ زرق برق لباسوں میں ملبوس ، ہیرے جواہرات سے لدی پھندی ہر عمر کی خواتین سے مڈ بھیڑ شروع ہوئی اور اس ساری بھیڑ بھاڑ میں ، میں کسی ایسی خاتون کے دیدار کو ترستی ہی رہ گئی جس کے چہرہ پر میک اپ کی تہ کی تہ نہ چڑھی ہو ۔ خیر! یہ تو مزاج اپنا اپنا یا ذوق اپنا اپنا اور آج کل اصلی کوئی چیز ملتی ہی کہاں ہے جو روپ کسی کا اصلی دکھائی دے ۔ دلہن کئی لڑکیوں کے جھرمٹ میں کراچی کی شادی کے گیتوں کے سایہ تلے لائی گئی اور ابٹن کی رسم سارے لوازمات کے ساتھ انجام پائی ۔ ایمان کی کہوں مجھے بڑا اچھا لگا اور اچھا کیوں نہ لگتا (ہماری تہذیب شمالی امریکا میں بھی پنپ رہی تھی) کہ یہ رسمیں اور گانے تو نئے پیمان وفا باندھنے والوں کو ایک حسین رومانٹک وفا کا درس دیتے ہیں کہ ان پیارے بولوں کی لے بے جا مطالبوں اور امیدوں کے بوجھ تلے دب کر ٹوٹنے نہ پائے ۔

سمدھیانے سے عورتیں مہندی لے کر بھی پاکستان کی تہذیبی روایت کے مطابق ، یعنی وقت مقررہ سے ڈھائی گھنٹے دیر کر کے ڈھول گانے کے ساتھ آئیں ۔ مہندی کی سجاوٹ آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی ۔ مجھے تو ایسا لگا کہ ہمارے پاکستان ہندوستان سے مہندی کی سجاوٹ سیکھنے کے لئے شاید عورتیں یہیں آتی ہوں گی ۔ خیر صاحب! یہ تو شادی کی رسومات کی معصوم معصوم ادائیں ہیں جن کا مقصد (شادی کے وقت تک ایک دوسرے سے قطعاً اجنبی) دولہا دلہن کو ایک دوسرے سے گانوں کے ذریعہ متعارف کرانا اور ایک نئی ذمہ دار زندگی کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے

اور کاش اس شادی میں ، میں نے اتنا ہی کچھ دیکھا ہوتا! مگر ایسا نہیں ہوا اور جہاں " کاش " کی آرزو پیدا ہو جائے ، وہاں ایسا ہوتا بھی نہیں ہے ۔ سو کیا دیکھتی ہوں کہ آناً فاناً اتنے وسیع ہال میں کھلبلی سی مچ گئی ۔ سب لوگ گرتے پڑتے ایک

طرف کو بھاگے۔ اپنی کم زوری کیوں چھپاؤں۔ بھاگنے والوں میں تو میں بھی شامل تھی۔ اگرچہ تیز نہ دوڑ سکنے کی وجہ سے ذرا دوسروں سے پیچھے تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ صور پھونکا گیا ہے۔

دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے سمجھا کہ بلڈنگ میں آگ واگ لگ گئی ہے اور میں مہندی کی رسومات دیکھنے کے شوق میں آگ کا سائرن نہیں سن سکی۔ سو اپنی ہی طرح پیچھے رہ جانے والی خاتون سے بے حد فکر مند ہو کر پوچھا کہ بھئی آگ کہاں لگی ہے۔ معلوم ہوا کہ جس طرف خلقت دوڑ رہی ہے، وہاں جہیز کا سامان دکھایا جا رہا ہے۔ آگ بلڈنگ میں لگی ہو یا نہ لگی ہو، میرے تن بدن میں تو ضرور لگ گئی۔ میں وہیں سے واپس ہال میں آکر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر ہی میں خواتین جہیز کے ہوش ربا نظارے سے جانبر ہو کر واپس آنا شروع ہوئیں۔ ان کی گفتگو سے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ یہ تھیں کہ لڑکی کو جہیز میں سجا سجایا مکان ملا ہے۔ لڑکی رخصت ہو کر اپنے جہیز کے مکان سے اپنی نئی زندگی شروع کرے گی۔ دس سیٹ، بھاری زیورات کے بے تحاشا مختلف فیشن کے جوڑے، کیش دولہا کو سلامی کے طور پر ۔۔۔ لڑکے کا اپنا بہت کامیاب بزنس ہے اور لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ یہ سب تبصرہ سن کر مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہا ہے۔

گھر واپس آئی تو ذہن و دماغ خاصا الجھا ہوا تھا۔ تو کیا سارا شور و غوغا، جو جہیز کی مذموم رسم کے خلاف ہوتا رہتا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے؟ کہتے ہیں پاک و ہند میں جہیز پورا نہ ہونے کی وجہ سے لڑکیاں بڑی عمر تک بے بیاہی رہ جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ماں باپ مجبوری میں لڑکیوں کو جہیز دیتے ہیں تاکہ یہ قیمت ادا کر کے اپنا آئیڈیل داماد حاصل کر سکیں۔ لیکن یہ نارتھ امریکا میں (نارتھ ناظم آباد نہیں)

والدین کو کون سی مجبوری درپیش تھی جو لڑکی کو جہیز بھی دیتے ہیں اور اس کی نمائش بھی کرتے ہیں؟ پھر اگر جہیز واقعی ایسا ہی ناسور ہے جیسا کہ ہندوستان پاکستان میں واویلا ہوتا ہے تو پاک وہند سے آئے ہوئے افراد اس ناسور کو شمالی امریکا میں پروان چڑھانے کے لئے کیوں کوشاں ہیں؟

## رشتے ناتے

انسان دنیا میں تنہا آتا ہے۔ بہت سارے نئے وجود اور پیارے رشتوں کو جنم دیتا ہے، دوست احباب بناتا ہے۔ سماجی معاشرتی زندگی گذارتا ہے، اپنے حوصلہ، امنگ اور عزم کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے پیاروں کو جی بھر کر پیار کرتا ہے اور کچھ عرصہ تک اس دھوکے میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ دنیا میں تنہا نہیں ہے، لیکن اس کی یہ سوچ ہی سب سے بڑا دھوکا اور فریب ہے اور یہ دھوکا جب ٹوٹتا ہے تو اس کا وجود، اس کی شخصیت پارہ پارہ، ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے مگر ہائے رے انسان اور اس کی سخت جانی! وہ اپنی مختصر سی زندگی میں ہزار بار مرتا ہے اور ہزار بار جینے کے جتن کرتا ہے۔ جیسے ایک مٹی کی مورت بچہ کے ہاتھ سے گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے، لیکن بچہ بڑے چاؤ اور امیدوں سے اس کے ٹکروں کو جمع کرکے انہیں گوند یا آٹے سے چپکا کر پھر سے اس مورت کو سالم بنانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح ہم بھی ہر دم اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کو جھوٹی تسلیوں کے گوند سے چپکا کر سالم بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، مگر انسان مٹی کی مورت تو نہیں ہے نا!

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ رہن سہن کے طور طریقے اور آپس کے تعلقات کے اقدار بھی بدلتے رہتے ہیں، تاہم کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے یہ حسرت بھرا احساس چٹکیاں لیتا ہے کاش وہی لوگ اپنی ساری قدامتوں کے ساتھ اسی طرح

ہماری زندگی میں رچے بسے ہوتے جیسے کبھی تھے اور جن کی قدر ہم نے اتنی نہیں کی جتنی کرنا چاہئے تھی تو کتنا اچھا ہوتا!

جانے وہ سارے عزیز و اقارب کہاں چلے گئے جو بچپن میں ہر طرف سایہ دار درختوں کی مانند پھیلے رہتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ بچے ان بزرگوں سے جان چھڑانے کے چکر میں رہتے تھے۔ پھوپھی جان ہیں کہ چمٹا کر پیار کرنے پر تلی رہتی تھیں حالانکہ ان کے پسینے کی خوشبو بچوں کو میٹھی سے زیادہ کھٹی لگتی تھی اور ان کی آغوش سے چھوٹ بھاگنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں تمیز اور ادب کے جو ڈھیروں سبق پڑھائے جاتے تھے۔ ان سے مفر کہاں تھا۔ پھر ایک رشتہ کے چچا جو اتنی ٹافیاں لاکر دیتے تھے کہ بعد میں ٹافیاں کم اور ان کے کھانے کی پاداش میں جھڑکیاں زیادہ ملتی تھیں کہ بہت میٹھا کھانے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں۔ ویسے بہت ساری چاکلیٹ ملنے کا بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ چند دنوں تک کے لئے پاس پڑوس کے بچوں میں اہمیت خاصی بڑھ جاتی تھی۔

جب ذرا بڑی ہوئی تو امی سے بڑا شکوہ رہتا تھا کہ طرح طرح کے رشتہ داروں کو گھر میں جمع کر لیتی ہیں۔ ٹی۔ وی۔ لاؤنج کی تو بات ہی چھوڑ دیں کہ ان دنوں یہ اصطلاح رائج ہی نہیں ہوئی تھی۔ نہ کوئی سونے کا کمرہ ڈھنگ سے رہ سکتا ہے نہ برآمدے کا چوکی کا فرش سلیقہ سے۔ مصیبت یہ تھی کہ امی کو نزدیک تو نزدیک دور دراز کے رشتہ داروں سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ ویسے ملنے ملانے والوں کا حلقہ بھی ان کا کافی وسیع تھا۔ وقت بے وقت کسی بھی تعداد میں ملنے ملانے کے لئے کوئی آجائے، کیا مجال جو امی انہیں کھانا کھائے بغیر جانے دیں۔ جلدی سے کچھ بھاجی وغیرہ بنا لی، ضرورت بھر چاول ابالے اور کھانے پر روک لیا۔ اس طرح کے کھانے میں تکلف نہیں صرف پیار اور خلوص ہوتا تھا، اس لئے سادہ اور معمولی کھانا کھا کر بھی آنے

والے ان کی محبت اور اخلاق کے مزید گرویدہ ہو کر بادل ناخواستہ واپس جاتے تھے۔
امی تو مشترکہ خاندان کی پروردہ تھیں۔ ہم لوگ جب ذرا بڑے ہوئے تو ہر طرح کے لوگوں کو مجبوراً برداشت کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوئی اور خدا کا شکر ہے کہ یہ صلاحیت پیدا ہوئی ورنہ شاید مشترکہ خاندان کا شیرازہ منتشر کرنے کی اولین ذمہ داری میری ہی ہوتی۔ ایک طرف تو رشتہ کی پھوپھیاں، چچیاں جب بھی آتیں میرے سراپے پر ناقدانہ نظر کے ساتھ ساتھ تبصرے ضروری تھے۔

"ارے! کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ سچ! لڑکیاں تو کھیرے ککڑی کی مانند بڑھتی ہیں۔"

"کوئی لڑکا وڑکا نظر میں ہے کہ نہیں؟" (امی سے سوال ہوتا)۔

"ارے! اتنی بڑی ہو گئی، اب تک ڈھنگ سے دوپٹا اوڑھنا بھی نہیں آیا؟"
(دوپٹا کبھی مرضی سے اوڑھا ہوتا تو آتا نا!)۔ بڑا غصہ آتا تھا یہ سب باتیں سن کر۔
اب یہ سارے رشتہ دار ایک دوسرے سے دور دراز جا بسے ہیں تو ان کی یاد بے حد ستاتی ہے۔ دوست احباب اور ملنے ملانے والوں کی کمی نہیں ہے، لیکن پھر خون کے رشتوں کی گرمی کا کوئی بدل نہیں۔ عزیز تو خون کے جوش سے مجبور ہو کر ایک دوسرے میں دل چسپی لینے پر مجبور ہیں۔

"ارے! دیکھو تو یہ منا (جو ابھی ابھی اس دنیا میں وارد ہوا ہے اور دوسروں کو صرف ہمکتا ہوا گوشت کا لتھڑا دکھائی دیتا ہے)۔ اس کی ناک بالکل دادا پر گئی ہے (دادا جن کے انتقال کو ۲۵ سال گذر چکے ہیں)، رنگ بالکل نانی کا سا ہے، ناخن چچا پر اور ہونٹ ماموں پر گئے ہیں (اور مکمل بچہ ماں باپ پر)۔"
اگر کوئی عزیز رشتہ دار ضعیفی کی وجہ سے معذور ہو جاتا تو ایک قیمتی ورثہ کی مانند ان کی قدر اور دیکھ بھال ہوتی، لیکن یہ سب ماضی کی بھولی بسری داستانیں ہیں۔

آج زمانہ کا مطالبہ اور ترقی یافتہ قدروں کی رو سے دیکھئے تو مشترکہ خاندان بہت سی جذباتی شکست وریخت کو جنم دیتا ہے اور بہت سے سماجی جرائم کے جنم لینے کا باعث ہے جب ترقی یافتہ افراد نے مشترکہ خاندانوں اور رہن سہن سے نجات حاصل کر لی تو افراد خاندان صرف میاں ، بیوی اور ان کے بچے ٹھہرے ، مگر یہاں بھی میاں بیوی کو دوسرے بچہ کی خاطر شخصی آزادی کو گروی رکھنا پڑا ۔ اب رجحان یہ ہے کہ شادی کے بعد فریقین جب جی چاہا الگ الگ اپنی راہ لگ لئے ۔ بچہ فلاحی ریاست میں حکومت کی ذمہ داری ہے ورنہ فلاحی اداروں اور یتیم خانوں کی یا بہت ہوا تو عشق کی گرما گرمی وہ لوگ ، جنہیں اپنی اولاد ، اپنے خون کے لئے قربانی دینے اور ذمہ داریاں نبھانے کی صلاحیت نہیں ہوتی اصلی ماں یا باپ سے بچہ چھڑا کر انتہائی ناپائدار جذبات کے رشتوں کے حوالہ کر دیتے ہیں ۔

پرانے طرز کے خاندانی ڈھانچے میں ہزار عیوب ہی ، لیکن انسان کے لئے یہ فیملی قلعہ کا کام کرتی تھی جس قلعہ سے وہ حوادث زمانہ کے خلاف تحفظ کے ساتھ جنگ کر سکتا تھا ۔ اب سارا تحفظ ، طلاق ، شادی سے پہلے بچہ ایک والدین کی سرپرستی جیسے ، نئے نئے دل خوش کن انداز زندگی پیدا ہو گئے ہیں ۔

لیجئے ! بات کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک پہنچ گئی ۔ حسین ماضی سے سفر شروع ہوا اور مسائل سے بھرپور حال تک پہنچ کر سماجی لحاظ سے مایوس کن مستقبل سے آس تو لگانی ہی پڑے گی ۔

## فوڈ بینک

امریکا میں فوڈ بینک کا چرچا بھی بہت سننے میں آیا ۔ ابتدا میں تو فوڈ بینک کی اصطلاح کا صحیح مفہوم ہی نہ سمجھ پائے ۔ سمجھا کہ شاید اقوام متحدہ کے کسی ادارہ کی کوئی تنظیم ہو گی جو پس ماندہ ، قحط زدہ علاقوں کو غذائی اشیا انسانیت کے رشتہ کے

ناتے مفت مہیا کرتا ہے اور اس کے معاوضہ میں عالمی طاقتیں وہاں اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کا سودا نہیں کرتیں۔ دوسروں سے پوچھنے میں شرم آتی تھی کہ کہیں لوگ انگریزی زبان سے بالکل ہی نابلند سمجھ کر فوڈ اور بینک کے لغوی معنی نہ سمجھانے بیٹھ جائیں۔ خیر! آہستہ آہستہ یہ عقدہ کھلا کہ ان غذائی بینکوں میں کھانے پینے کی وہ اشیا جمع کی جاتی ہیں جو ضرورت سے فاضل ہونے کی بنا پر صاحب حیثیت لوگ پھینک دیتے ہیں۔ حکومت بھی ان اداروں کی سرپرستی کرتی ہے اور حاجت مندوں کو ان غذائی بینکوں سے روزانہ کی خوراک مفت ملتی ہے، تبھی ذہن برس ہا برس پہلے اپنے ماضی کی کتاب یادداشت کی ورق گردانی کرنے لگا۔

مودی خانہ (وہ کوٹھری جہاں مہینے کے استعمال کا اناج اور گھر کا فاضل سامان رکھا جاتا تھا اور جسے اب ہم اسٹور روم کہتے ہیں) میں میری والدہ کھانا پکانے کے لئے اناج تول کر باورچن کو دیتی تھیں۔ تولنے کے بعد ایک ایک مٹھی چاول دال آٹا نکال کر علیحدہ ایک مٹی کے مٹکے میں ڈال دیتی تھیں۔ بچپن میں جب بھی والدہ کے ہمراہ مودی خانہ میں گئے، یہ منظر دیکھتے رہے اور ناپختہ ذہن یہ سمجھتا رہا کہ شاید تول میں زیادہ ہونے کی وجہ سے اماں فاضل اناج نکال دیتی ہیں۔ آخر ایک روز پوچھ ہی بیٹھے تو اماں سے معلوم ہوا کہ گھر بھر کے پیٹ بھر کھانے کے لئے جتنا اناج ضروری ہوتا ہے، اتنا تول کر اس میں سے ایک مٹھی ان حق داروں کا حق نکال دیتی ہیں جو ہماری طرح پیٹ بھر کھانے کی استطاعت تو نہیں رکھتے، لیکن جن کا حق ہمارے دسترخوان پر اتنا ہی ہے جتنا گھر کے دوسرے افراد کا۔ اس اناج کو "مٹھیا کا اناج" کہا جاتا تھا اور یہ ان لوگوں کو دیا جاتا تھا جو ضرورت مند ہوتے تھے، لیکن گداگر نہیں۔ غالباً اس زمانہ میں ہر گھر میں مٹھیا کا اناج نکالنا مروجہ دستور تھا۔ یہ دسترخوان کے حق دار کو بہت پوشیدہ طور پر دیا جاتا تھا کہ ان کی خودداری مجروح نہ

ہو۔ اس وقت تو والدہ نے جو وضاحت کی ہم نے سن لی، لیکن اب سوچتے ہیں تو بہت تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تو خواتین آج کے مفہوم میں تعلیم یافتہ تھیں نہ معاشی مسائل اور ان کی پیچیدگیوں سے واقفیت رکھتی تھیں، پھر ان گھریلو خواتین نے فوڈ بینک کی ایجاد کیسے کی اور اب جبکہ مٹھیا کا یہ طریقہ ہمارے ترقی پذیر ملک میں متروک ہو چکا ہے، فوڈ بنک کے مقابلہ میں اس کا تذکرہ کرنا بھی جہالت اور احساس کمتری کی علامت سمجھی جائے گی کہ ہماری تو قومی عادت ہے کہ جہاں کسی نے مسائل کے حل کے لئے کوئی اقدام لیا، فوراً دعویٰ کر بیٹھے کہ یہ بات تو ہمارے مذہب، کلچر یا آباؤ اجداد نے بہت پہلے کہی تھی جیسے ابھی ہم نے کہہ دیا کہ غذائی بینک کی بنیاد تو ہمارے معاشرہ میں مٹھیا کی شکل میں اور ہماری سادہ لوح انسان دوست خواتین کے ہاتھوں بہت پہلے رکھی جا چکی تھی۔ اب تو سادہ لوح عوام کے بینک اکاؤنٹ سے ذکات کاٹی جاتی ہے تاکہ برسراقتدار افراد کی تصاویر بیوہ عورتوں کو سلائی کی مشین عطا کرتے وقت لی جا سکے۔

## ہم نے آنکھیں دان کر دیں

چرچا تو بہت سنتے تھے، لیکن کبھی سنجیدگی سے آنکھیں دان کرنے کی بات پر دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ زندہ جاوید رہنے کی تمنا تو شاید انسان کی سرشت میں ہے۔ نام تو انسان مختلف طریقوں سے دنیا میں کما سکتا ہے، شہرت بھی کارہائے نمایاں انجام دے کر حاصل ہو جاتی ہے، لیکن تشفی تبھی ہوتی ہے جب اپنے وجود سے دوسری زندگی کا چراغ روشن کیا جائے۔ اسی لئے تو اولاد کی تمنا انسانی سرشت کا خاصہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج کے سائنسی دور میں جسمانی اعضا کے عطیات دینے کے رجحان اور میڈیکل سرجری کے ذریعہ پیوندکاری کے فروغ کو خاصی مقبولیت حاصل

ہو رہی ہے ۔ اپنا خون ، گردہ ، قرنیہ وغیرہ اگر دوسروں کے جسم میں گردش کرتے رہیں یا اسے موت کے منہ سے بچا سکیں تو انسان کے دو عظیم جذبوں اور تمناؤں کی تکمیل ہوتی ہے ۔ ایک کسی کے ساتھ نیکی کر کے اس کی حیات نو کا باعث بننے کی اور دوسرے یہ احساس کہ اگر اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا تو ہم رہتی دنیا تک اپنا وجود اور آنکھوں کا عطیہ چھوڑ چلے ۔ کسی بے نور کو نور بخشنا اس سے زیادہ عظیم طریقہ زندہ رہنے کا کیا ہو سکتا ہے ۔ ذرا تصور کریں ! بستر مرگ پر یہ احساس ہو جانے کے بعد کہ ہم اس دار فانی میں چند لمحوں کے مہمان ہیں ، بے بسی کے ساتھ اپنی دنیاوی زندگی کے اعمال کا جائزہ لے رہے ہیں اور تاسف کر رہے ہیں کہ بقول شاعر :

واں سے کچھ ساتھ اپنے تو لائے نہ تھے
یاں سے کھانے کو لے کے دفتر چلے

اس وقت اپنی یہ وصیت کتنی تقویت بخش ہو گی کہ ہم نے اپنی بینائی کسی نابینا کو بخش دی ہے ۔ جن کے لئے دنیا تاریک تھی ، انہیں آنکھوں کا نور تحفہ میں دے دیا ہے اور یہاں سے کھانے کو جو دفتر لے چلے ہیں ، اس میں اپنے بیلنس میں یقیناً ایک بے بہا اضافہ ہوا تو شاید اسی طرح کچھ کردہ و ناکردہ گناہوں کے فہرست میں کچھ کمی ہو جائے ۔ ان تمام الٹے سیدھے اور الجھے خیالات کے ہجوم میں ہم عطیہ چشم کے کیمپ تک اس لڑکی کے ہمراہ پہنچ گئے جس نے گیٹ ہی سے ہمیں اور عشرت کو اغوا کر لیا تھا ۔ اصل میں ہم لوگ ایک جلسہ میں شرکت کرنے گئے جہاں مختلف اسٹالوں کے ساتھ ہی ایک اسٹال آنکھوں کا عطیہ حاصل کرنے کے لئے لگا ہوا تھا یہاں کئی والنٹیر لڑکیاں عطیہ چشم کے وصیت نامہ پر کوائف اور گواہوں کے دستخط لے رہی تھیں ۔ ہم اور عشرت ساتھ گئے تھے ، سو ہم ایک دوسرے کے گواہ بنے اور مرنے کے بعد اپنی آنکھیں اور زندگی کے کچھ نقد کی شکل میں اس کار خیر کے لئے چندہ دے کر

آگے بڑھے خوشی، فخر اور طمانیت کے انوکھے سے جذبہ سے سارے وجود کو سرشار کرتے ہوئے۔

## معاشرہ اور بحران

موجودہ سیاسی معاشرہ، یعنی نمائندہ جمہوریت جس کی بنیاد آزاد انٹرپرائز یا سرمایہ دارانہ نظام پر ہے، زبردست کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس بحران کا مظاہرہ مختلف طریقوں سے ہو رہا ہے۔ مثلاً سکہ کی قیمت کا گرنا یا اتار چڑھاؤ، اخلاقی اقدار کی پامالی جذباتی کسمپرسی، چند بین مثالیں بحران کی ہیں۔ جو چیز اظہر من الشمس نہیں ہے، وہ یہ کہ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے جبکہ گذشتہ تقریباً ۵۰ سال، جو دوسری جنگ عظیم کے بعد بہتات کا دور رہا ہے، ایسے تصورات و نظریات سے پر ہے جن کا مقصد اجتماعی کوششوں سے انسانی حالات، اس کے حال اور مستقبل کو سدھارنا اور سنوارنا رہا ہے۔ ایسی کون سی خامی یا کمی رہ گئی ہے جس نے حالات کو سدھارنے کی بجائے اور بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر افراط زر کو روکنے کی تمام کوششوں نے افراط زر کو بڑھانے ہی میں مدد دی ہے۔ جرائم کو روکنے کی کوششوں نے نت نئے جرائم کو جنم دیا ہے۔ تعلیمی اصلاحات نے نام نہاد تعلیم یافتہ لوگ پیدا کئے ہیں اور اسی طرح کی بیسیوں دیگر مثالیں گنائی جا سکتی ہیں۔

ایک مختصر سی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ ہم اپنے نظام حیات میں ایسے تصورات رائج کرنا چاہتے ہیں جو اس کے بنیادی نظریہ اور کارکردگی سے متصادم ہیں جیسے بھاپ سے چلنے والے انجن کو جٹ جہاز میں رکھ کر ہم امید کریں کہ یہ انجن اڑنے لگے گا۔ کوئی باہوش و باخرد انسان یہ نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے یہاں فنی مجبوری آڑے آئے گی، لیکن جب یہی حرکت معاشرہ کے انجن کے ساتھ کی جاتی ہے تو ہم نہ صرف اسے برداشت کر لیتے ہیں بلکہ اس عمل کو ترقی پسندی اور آزاد خیالی سمجھ کر

خوب واہ واہ بھی کرتے ہیں، چنانچہ سماجی مشین دوسری مشینوں کی مانند صرف انہیں اصولوں کو برت کر کامیابی سے چلائی جا سکتی ہے جن کی بنیاد پر یہ مشین بنائی گئی ہے۔ وہی تہذیبی اور کلچرل بندھن اسے قائم رکھ سکتے ہیں جو سماجی مشین انفرادیت پرستی کے ڈھانچے پر تیار ہو گی، اسے نظریاتی اجتماعیت کے ذریعہ باعمل نہیں بنا سکتے اور یہ بھی ایک اہم وجہ ہے جس کی بنا پر ہمارے مسائل روز بروز بڑھ رہے ہیں اور زندگی کے بیش تر شعبوں میں سنگین سے سنگین تر بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ صنعتی جمہوریت کا ڈھانچا اجتماعی نظریہ کے بندھن اور تصورات کو بکار نہیں لا سکتا۔ ہمارے سیاسی اور سماجی نظام کو ذمہ دار آزادی کی ضرورت ہے۔

سوویت یونین سے آس لگا رکھی تھی کہ نظریہ اور عمل میں ہم آہنگی کے ہزار فقدان کے باوجود یہ نظام سرمایہ دارانہ نظام کی منفی کشمکش سے ہمیں نجات دلائے گا مگر فی الحال تو آثار کچھ امید افزا نہیں ہیں۔ اکثر مذاہب اپنی پوری عصبیت کے ساتھ اپنے مخالفین کو فنا کر دینے کے لئے تشدد کی کارروائیوں میں سرگرم عمل ہیں۔ چھوٹے بڑے سبھی ممالک، جنہیں کھانے کو روٹی، علاج کو دوا اور رہنے کو گھر میسر نہیں، اپنے اپنے مفاد پرست حکمرانوں کے طفیل ایک "عالمی آقا" کے اشارہ اور مدد سے جنگی ساز و سامان حاصل کر کے ہر اس قوم، ملک اور عقیدہ کے خلاف برسرپیکار ہیں جس کا اشارہ انہیں اپنے آقائے نامدار سے ملتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اتحادی طاقتوں کی مخالفت کر رہی تھی اور ان کی جنگ جیتنے کی کوششوں میں مزاحمت۔ سوویت یونین کا نازی جرمنی کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ تھا، اس لئے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے بھی اسے سامراجی مفاد کی جنگ قرار دے رکھا تھا۔ جوں ہی جرمنی نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے روس پر جارحیت کی (جانے جنگ کی

بنیادی نوعیت بھی تبدیل ہوئی کہ نہیں) تو لوگوں کو یہ سمجھایا گیا پارٹی ہائی کمان کی طرف سے کہ یہ اب عوامی جنگ ہے۔

تب ہم زندگی کی ابتدائی منزلوں پر تھے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کچھ تو ارتقا کے دور میں تھیں اور کچھ سائنٹفک سوشلزم کے رہبروں کے سپرد۔ اب جبکہ ہم حیات اور شعور کی منزلوں کی بلندی تک پہنچ چکے ہیں اور سوویت یونین بھی عظیم طاقت کی حیثیت سے اپنا وجود اور اہمیت کھو کر اب محض روس رہ گیا ہے تو حافظہ اور ڈائری کے اوراق پارینہ کی معروضی اور ذہنی غیر جانب داری کے ساتھ اور پارٹی سے نکال دیئے جانے کے خطرہ کے ٹل جانے کے بعد بے خطر ہو کر ان سارے شکوک و شبہات اور دلائل کا جائزہ لینے کو دل چاہتا ہے جو جائزے پارٹی کی شریعت میں ممنوع تھے جیسے ہمارے یہاں قرآن و سنت کی روشنی میں بھی اجتہاد کرنا ممنوع ہے۔

اسٹالن کی موت پر بہت روئے تھے۔ لگتا تھا کوئی اپنا بہت ہی پیارا ہمیں چھوڑ گیا اور پھر ہم جیسے کٹر پنتھیوں کا اسٹالن سگے سے بھی بڑھ کر نہیں تو اور کیا تھا۔ ہمیں تو محسوس ہوتا تھا کہ مستقبل کی ساری امیدیں، ساری درخشانی اسی کے دم سے وابستہ ہے۔ مارکس اور اینجل تو نظریہ تھما کر چلے گئے اور لینن اور اسٹالن، جو اس نظریہ کی صحیح تشریح اور اس پر مارکسزم کے اصولوں کے ماتحت عمل کر سکتے تھے، وہ بھی یکے بعد دیگرے چل بسے تو اب امریکا کے دیو زاد سامراج کا مقابلہ کون کرے گا بہرحال آہستہ آہستہ صبر بھی آتا گیا اور سوویت یونین کے نت نئے کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں کو اسٹالن کی جگہ دینی ہی پڑی۔ پھر دل کو یہ بھی سمجھایا کہ ہم تو مارکسزم کے پرستار ہیں۔ ہمیں شخصیتوں سے متاثر ہونا اور رہنمائی حاصل کرنا زیب نہیں دیتا کچھ وہی کیفیت سوویت یونین کی شکست و ریخت پر بھی ہوئی۔ خروشیف کی لائن آہستہ آہستہ آتی رہی اور ذہن قبول کرتا رہا بلکہ لگتا تھا کہ یہی متوازن اور صحیح

مارکسسٹ طرز عمل ہے، لیکن سوویت یونین کے حادثہ نے تو پھر کچھ عرصہ کے لئے ہی سہی، آنے والی صبح نو کے خواب ہی چکناچور کر دیئے۔

اب ہم جتنی بھی تنقید سوویت کیمونسٹ پارٹی، ان کی حکومت یا لینن اور اسٹالن کی کر لیں، انہیں ڈکٹیٹر شپ آف دی پرولتاریت کے مجاہد کی جگہ عوام پر ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کا الزام دیں، لیکن جب بھی یاد آتا ہے کہ سوویت یونین کی تو کب کی تجہیز و تکفین بھی ہو چکی تو ایک خلا کا احساس ہوتا ہے۔ دل کو از سر نو ٹھیس لگتی ہے، جذبات میں اتھل پتھل ہوتی ہے اور بار بار پیروں کے نیچے سے زمیں سرکتی محسوس ہوتی ہے اور پورے کا پورا وجود ڈگمگا اٹھتا ہے۔ اب اس کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کریں اور یہ ثابت کرنے کے لئے سیمیناروں، جلسوں اور بحث مباحثہ کو منظم کرتیں چلیں کہ یہ امریکی سازش ہے جس نے میڈیا کے ذریعہ پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ سوویت نظام ناکام ہو چکا یا سائنٹفک سوشلزم کی دھجیاں اڑ گئی ہیں اور نہ اب ہم اس بات کا پورے وثوق سے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ مارکس کا فلسفہ اپنی جگہ قائم و دائم ہے صرف اس پر عمل کرنے والا طریقہ کار یا نظام غلط ثابت ہوا ہے اور مناسب وقت آنے پر ساری پرانی اینٹیں جوڑ کر یا نئی اکٹھا کر کے زیادہ عظیم الشان سوویت یونین کی عمارت تعمیر کر لی جائے گی لیکن سب کچھ اتنا جلدی کیسے اور کیوں ہو گیا؟ ابھی تو عالمی کیمونسٹ پارٹیاں یہ فیصلہ بھی نہ کر پائی تھیں کہ آیا گورباچوف کو امریکا کے مفاد کا ایجنٹ ٹھہرائیں جس نے کی حکمت عملی کو سوویت یونین کو توڑنے کے لئے گڑھی ہیں یا واقعی یہ کیمونزم اور سوویت یونین کی مارکسی بقا کے لئے ضروری ہے۔ یہ سب اس طرح ہوا جیسے کوئی اچھا بھلا چنگا عین عالم شباب میں لقمہ اجل بن جائے اور مسیحاؤں کو پتا بھی نہ چلے کہ کیا مرض ہوا تھا۔ لیتھونیا، اسٹونیا لیوتیا کی بالٹک ریاستیں جب سب سے پہلے یونین سے علیحدہ ہوئیں

تو دھماکا ختم ہوتے ہی ایسا لگا کہ مخفی طور پر علیحدگی کی منظم تیاریاں پہلے سے مکمل تھیں ۔ امریکا کے ہاتھ تو پورے کرہ ارض کا لٹو آگیا ہے ۔ جیسے چاہے نچائے ۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جو پانچ بڑے ابھرے تھے ان میں امریکا اور سوویت یونین ایک دوسرے کے اصل حریف تھے ۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت اور نتیجتاً سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد اب اقوام متحدہ سے باہر سات بڑے وجود میں آگئے ہیں جن کے آگے خروشیف کو کاسہ گدائی لے کر دست سوال دراز کرنا پڑا تھا ۔ سپنوں کے دیش کے اس راجا کی یہ تحقیر! ایسا محسوس ہوا جیسے ہماری اپنی ذات، اپنی خودداری مجروح ہو رہی ہے ۔ ان سات بڑوں کو روس میں خانہ جنگی پھوٹ پڑنے کا خدشہ بھی بے تحاشا ستانے لگا ہے ۔

مستقبل کے مورخین جب ۱۹۹۳ء کا جائزہ لیں گے تو یقیناً بین الاقوامی پس منظر میں اسے بنیادی اور انقلابی تبدیلیوں کا سال قرار دیں گے ، اسی طرح جیسے ۱۹۴۵ء میں جب امریکا نے ایٹم بم کا نشانہ ناگاساکی اور ہیروشیما کو بنایا اور جاپان کو اپنی ہزیمت تسلیم کر کے ہتھیار ڈالنا پڑے ۔ اس وقت بھی امریکا کی برتری کا (بادل ناخواستہ ہی سہی مگر) قائل ہونا ہی پڑا تھا اور یہ امید انسانیت نے لگائی تھی کہ اب جنگ کے شعلے رہتی دنیا تک کے لئے سرد ہو گئے ۔ جاپان اب بیرونی حملہ آوروں سے تحفظ کے لئے نہ تو فوج رکھنے کا مجاز ٹھہرا اور نہ ریاست کے اقتدار اعلیٰ کے لئے دوسرے ملکوں سے جنگ کر سکتا تھا ۔

اقوام متحدہ کے قیام نے گویا امن عالم کی راہوں میں پھول بکھیر دیئے ۔ اب پچھلے خوابوں کی تعبیر حسین ملی یا بھیانک ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوویت یونین کے زوال کے بعد "امریکا کی عالمی برادری" کے نعرہ نے چھوٹے اور پس ماندہ ممالک کے گرد شکنجہ مزید تنگ کیا ہے ۔ واحد سپر پاور کو اب میدان صاف ملا ہے کہ جس کو

چاہے چیرے پھاڑے، جس کا چاہے ستیاناس کرے۔

جیسا کہ کہیں بیان کر چکے ہیں مارکسزم اور کیمونزم سے ابتدائے عمر ہی سے متاثر اور مسحور دونوں ہی ہوئے۔ سمجھتے تھے کہ مارکس کا مادی جدلیات کا فلسفہ اپنی ساری جزویات اور تشریحات کے ساتھ ابدی صداقت کا حامل ہے۔ مارکس اینجلس کے ساتھ ہی لینن اسٹالن کو بھی مارکسزم کے گرو سمجھا کئے۔ ایسے گرو جن سے اختلاف رائے سرے سے انٹی مارکسزم ہے۔ جیسے فقہ کے چند اصول وضع کر لینے کے بعد اجتہاد کی ضرورت کو نہ صرف نظرانداز کیا گیا بلکہ بہت سے ملاؤں نے اپنی فقہ کے یقین کے بعد نئے اجتہاد کو سرے سے دین و مذہب کے منافی قرار دے دیا۔ اسی طرح مارکس اینجلس کے کیپیٹل کو پڑھنے کے بعد اسے لینن اور اسٹالن کے نقطہ نظر سے سمجھنا اور اعتماد رکھنا ضروری تھا۔ یوگوسلاویا کے ٹیٹو کے بنیادی اختلافات ان لیڈران سے کیا تھے، یہ تو ابتدا میں جان ہی نہ سکے، اس لئے کہ اپنے طور پر ٹیٹو کی نظریاتی حکمت عملی کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں مواد ہی میسر نہ ہوتا تھا۔ صرف یہی سنتے سمجھتے اور یقین کرتے رہے کہ ٹیٹو ترمیم پرست تھا۔ اس کے خیالات اور لائحہ عمل مارکسزم کے خلاف ہیں اور اس کی حمایت کرنا مارکسزم کی شریعت کے مطابق بدترین بدعت ہے۔ اسی طرح کا رویہ چین کی کیمونسٹ حکومت کے ساتھ روا رکھا گیا ایک طرف تو یہ دعویٰ تھا کہ کیمونزم میں شخصیت پرستی کی کوئی گنجائش نہیں، دوسری طرف شخصیت پرستی کا یہ عالم کہ جس نے بھی لینن اسٹالن کے نقطہ نظر سے اختلاف کرنے کی جسارت کی، وہ پارٹی کا غدار ٹھہرا۔ بہت ساری باتیں لینن اسٹالن کی تعلیمات میں متضاد لگتی تھیں۔ انہیں ذہن تو نہیں، لیکن دل کو تسلیم کرا لیتے تھے مثال کے طور پر غیر طبقاتی معاشرہ کی بات۔ یہ غیر طبقاتی معاشرہ کیسے قائم ہو گا، کیسے ایسا نظام وجود میں لائے گا جہاں ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق پیداوار میں

حصہ لے گا اور اپنی ضرورت کے مطابق معاوضہ پائے گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں کم پیداوار کرنے والے کو زیادہ اور زیادہ پیداوار کرنے والے کو کم حصہ ملے۔ پھر یہ معمہ بھی میرے لئے لاینحل رہا کہ بھلا اگر غیر طبقاتی معاشرہ میں ہر فرد کی ضروریات یکساں نہ ہوئیں تو! بعض پیداواری محنت ایسی بھی ہوتی ہے جس میں زیادہ آرام اور آسائش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے دھوپ میں کام کرنے والے مزدور کو نہ تو ایرکنڈیشنز کی ضرورت ہوتی نہ یہ آرام اسے مہیا کیا جا سکتا ہے۔اس میں کام کرنے والے ایرکنڈیشنز استعمال نہ کریں گے تو کیا اس تقسیم کو کام صلاحیت کے مطابق اور ضرورت کے مطابق کہیں گے؟ غیر طبقاتی معاشرہ میں ہر فرد کی ضردیات یکساں نہ ہوئیں تو پھر بات بھی کہاں بنے گی۔ صلاحیتیں تو خیر ہر انسان کی مختلف ہوتی ہیں، لیکن بنیادی ضروریات، جنہیں معاشرہ مہیا کرنے کا پابند ہے، وہ تو یکساں ہونی چاہئیں۔ ایک بار اپنے لیڈر سے ہم نے اس موضوع پر جرح کرنے کی ہمت کر لی تو خوب ہی ڈانٹ پڑی کہ یہ مارکسزم لینن‌ازم کے خلاف ہے۔

تواریخ کا مادی نقطہ نظر تو پوری طرح سمجھ میں آیا کہ انسانی تواریخ، ادارے اور معاشرہ سبھی کشمکش اور تضاد کے طور پر وجود میں آتے ہیں، لیکن جب غیر طبقاتی معاشرہ قائم ہو جائے گا تو کون سی طاقت انسان اور اس کے اداروں، اس کی سائنس اور حکمت کو آگے بڑھانے میں معاون ہو گی کہ کشمکش کی ساری راہیں تو طبقات کے ساتھ ہی مسدود ہو جائیں گی۔ پھر جب ریاست طبقات کے ختم ہونے کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنی افادیت کھو بیٹھے گی اور نتیجتاً WITHERAWAY ہو جائے گی تو آخر معاشرہ میں امن و امان کیسے قائم رہے گا؟ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت ساری نفسیاتی اور جذباتی ناآسودگیوں کے باعث بہت سے افراد مجرم اور قاتل بن جاتے ہیں۔ آخر یہ نظم و ضبط قائم رکھنا کس کی ذمہ داری ہو گی؟

سرمایہ دارانہ نظام کا بحران اور خاتمہ اس نظام کا اندرونی تضاد اس کا زوال لائے گا اور تب اشتراکیت کا سارے جہاں میں بول بولا ہو گا، لیکن فی الحال تو کسی اور تضاد نے اشتراکیت کو کم از کم کمزور تو کر ہی دیا ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام اپنے سارے تضادات کے ساتھ ترقی پذیر ہے، شاید اس لئے کہ اس نے تضادات کو سمیٹنے اور ان سے سمجھوتا کرنے کا گر سیکھ لیا ہے۔

ہم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جہاں زندگی کے بیش تر ماہ و سال گذارے، وہاں مذہب تو تھا لیکن مذہبی تعصب نہ تھا۔ ہمارے یہاں انسانوں کو انسانیت کے پیمانہ پر جانچا جاتا تھا، نسل، مذہب اور دولت پر نہیں۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو نسلی برتری کی تباہ کاریاں کس حد تک جا سکتی ہیں اور زمانہ حال سے بڑھ کر انسانیت کے مستقبل کے لئے یہ کس قدر خطرناک ہیں، شاید اس کا اندازہ رہبران قوم کو نہ تھا، تبھی تو سوویت یونین نے جرمنی کے ہٹلر کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ وہ ہٹلر جو نسلی نفرت کی قربان گاہ پر ساری دنیا کو بھینٹ چڑھانے کا عزم لے کر اٹھا تھا۔

ہٹلر اور اس کی ریاستی طاقت کے نیست و نابود ہونے کے بعد امید تھی کہ اب کم از کم نسلی برتری کے عفریت سے نجات مل جائے گی اور سوویت یونین کے عظیم طاقت کی حیثیت سے جنم لینے کے بعد تو تمناؤں اور امیدوں کی دنیا اور بھی جگمگا اٹھی تھی کہ سیاں بھئے کوتوال! اب ڈر کاہے کا۔ اب تو روس کا مارکسزم کیمونزم دنیا سے استحصال، غریبی، نسل پرستی، نسلی منافرت، مذہبی فرقہ واریت وغیرہ وغیرہ ہر ظلم، ناانصافی اور برائی کا خاتمہ کر دے گا۔ بس ذرا سی دنیا کے مزدوروں کے ایک ہو جانے کی کسر ہے اور عالمی سطح پر ان کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے پھر دیکھیں گے حشر امریکن اسپرلزم کا۔

لیکن ہوا یہ کہ آج عالم انسانیت کو تین عفریتوں سے نپٹنا پڑ رہا ہے۔ (۱) سیاسی اور معاشی فوجی برتری کا عفریت (۲) خون ریز جنون کی حد تک مذہبی برتری کے احساس کا عفریت۔ (۳) نسلی برتری کے احساس کے عفریت کا بھوت اور واحد سپر پاور کی شکل میں مزید اور اسپرلزم کا بھوت تو اکلوتا ہونے کی بنا پر مسلط ہو ہی رہا ہے یہ تینوں عفریت ہمیشہ سے موجود تھے، چنانچہ کسی نہ کسی شکل میں انسانی معاشرہ استحصال کا شکار رہا ہے۔ تحقیق و سائنس کے اس دور میں جبکہ انسان نے کائنات کے اسرار و رموز پر سے بڑی حد تک پردہ ہٹا دیا ہے اور امید کی جاتی تھی کہ انسان کا یہ قدم انسانیت کی فلاح کی جانب اٹھے گا، ساری امیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔

## کچھ یادیں کچھ باتیں

ٹیچر جی کی مانند ترنم سے غزل گانے کی تمنا اماں کی سرزنش کے بوجھ تلے آکر دم توڑ گئی، چنانچہ دو بچوں کی ماں بننے، جیل خانہ کی ہوا کھانے اور انڈر گراونڈ کی زندگی کی تفریحوں کے بعد ذہن پھر موسیقی سیکھنے کی جانب بہکانے لگا۔ فرق اتنا ہوا کہ اس بار سرتال گلے کی بجائے انگلیوں سے نکلنے کا فیصلہ کیا، حالانکہ اب مکمل طور پر آزاد تھی اور گانا تو کیا کہ ناچنا بھی شروع کر دیتی تو اب اماں کچھ نہ کہتیں کہ بیاہی دانی بیٹی پر کیا اختیار، لیکن برسوں پہلے جو دکھ میں انہیں دے چکی تھی اس کا کفارہ تو ادا کرنا ہی تھا، چنانچہ اب کے ستار سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ گھر کے نزدیک ہی پٹنہ کالج میں ستار کے استاد کلاس لیتے تھے۔ پاکستان آئی تو ستار وہیں چھوڑ دیا کہ امنگوں کا تار بھی ٹوٹ گیا تھا اور مضراب بھی کھو گئی تھی۔

۴۶ء میں کلکتہ میں فسادات ہوئے تو ہم لوگ وہیں تھے۔ حبیب ٹور پر گئے ہوئے تھے۔ شہر میں کرفیو تھا اور صبح دو گھنٹوں کے لئے ہٹایا گیا تھا تاکہ لوگ

ضروری کام کر لیں ۔ تبھی گیٹ پر کچھ شور سا ہونے لگا۔ سمجھا کہ لو بلوائی آ پہنچے ۔ پھر کسی نے آکر بتایا کہ گیٹ پر کوئی صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہیں اور چوکیدار نے انہیں روک رکھا ہے ۔ باہر آکر دیکھا تو کامریڈ ماتھر تھے ۔ میری جان نکل گئی ۔ بھلا خالص مسلمانوں کے محلہ میں انہیں کیا شامت آئی جو جان ہتھیلی پر لے کر یہ آ پہنچے ۔

" تمہیں اور بچوں کو لینے آیا ہوں ۔ حبیب کے آنے کے بعد آجانا ۔ "

" نہیں بھیا! گھر اور محلہ چھوڑ کر آپ کے ساتھ جانے سے بلوہ تو ختم نہیں ہو جائے گا ، لیکن ان بہت ساروں کا کیا ہو گا جنہیں اپنے ساتھ محفوظ مقام پر لے جانے کوئی نہیں آیا ہے ۔ " کامریڈ ماتھر خاموشی سے بڑے دکھی ہو کر چلے گئے ۔

سلجھے ہوئے پرامن لوگوں نے امن کمیٹی بنائی ۔ کمیٹی میں کرتا دھرتا سبھی ہندو تھے ۔ ہر محلہ کے لئے ایک گروپ تشکیل دیا گیا تھا جو جگہ جگہ جا کر امن کا پرچار کیا کرتا تھا اور ان لوگوں سے جو اپنے گھناؤنے مقاصد کے حصول کے لئے آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے تھے ، انسانیت کے ناتے امن کی بھیک مانگتا ۔ جب میں ان لوگوں کے ساتھ گشت پر ہوتی تو امن کمیٹی والے ہندو محلہ میں جانے سے بہت گھبراتے تھے کہ کہیں کسی ہندو جنونی نے اس مسلمان لڑکی کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو وہ کیا منہ لے کر واپس جائیں گے ۔ چنانچہ جو علاقہ مسلمانوں کے لئے زیادہ محفوظ ہوتا اسی پر چلنے کی تاکید ڈرائیور کی ہوتی تھی ۔

جب ۴۷ء کا فساد ہوا تھا تو میں پٹنہ کالج میں پڑھتی تھی اور شام کو بانکی پور گورنمنٹ اسپتال میں زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے ہمارے گروپ کی ساری لڑکیاں والنٹیرنگ کرتی تھیں ۔ گھر سے اسپتال زیادہ دور نہیں تھا اور پیدل ہی آتے جاتے تھے ۔ ایک روز واپسی میں ذرا دیر ہو گئی ، یعنی رات کے نو بج گئے ایک بنگالی

بابو، جنہیں ہم لوگ چنا بابو کہتے تھے، میرے گھر کے سامنے ہی رہتے تھے۔ ابھی میں گھر کے اندر داخل بھی نہ ہو پائی تھی کہ مجھے دیکھ کر دھوتی سنبھالتے وہ لپک کر آئے، "جو ہرا! تم اتنا دیری کرکے اکیلا آتا ہے کوئی تم کو چھرا بھونک دیتا تو!"

چنا بابو مر گئے لیکن ان کا کردار کبھی نہیں مرے گا۔ آج کل مجھے وہ بے تحاشا یاد آنے لگے ہیں۔ کیا پاکستان میں کوئی چنا بابو نہیں پیدا ہو سکتا!

اگر آدم اور حوا کو یہ معلوم ہو جاتا کہ زندگی اتنی بھیانک تجربہ گاہ ہے تو وہ رو کر، گڑگڑا کر اپنے اکلوتے گناہ کی سچے دل سے معافی مانگ کر جنت ہی میں رہ پڑتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نا کہ جنت کی یکساں آسائشیں زندگی کو بے کیف اور پھیکی بنا دیتیں، لیکن آج جو ان کی اولادوں کو دکھ اور بے بسی کے اتنے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں تو کیا جنت میں ان کی روحیں تلملا نہ جاتی ہوں گی۔

سورج بھی ماہی گیر ہے اور انسان بھی جبکہ سورج کو ماہی گیر کہنا بڑا حسین تخیل ہے اور سورج کا دام کیا ہے ........ شفق جو ساری کائنات کو اپنے حسن کے جال میں اسیر کر لیتی ہے۔ ماہی گیر کے اس دام کا تانا بانا خود اس کی اپنی دم توڑتی ہوئی کرنیں ہیں اور انسان اللہ کی تخلیق کی ہوئی بزعم خود یہ ارفع ترین مخلوق یہ بھی تو ماہی گیر ہے، پر اس کے دام کا تانا بانا اس کی حرص، خود غرضی، ظلم و تشدد، بربریت، نفرت اور تعصب ہے اور اپنے اسی نفرت انگیز دام میں اس نے معصوم انسانیت کو اسیر کر رکھا ہے۔ سوج کا دام ہر روز دم توڑ دیتا ہے اور دوسرے روز پھر اسی آن بان سے موجود ہوتا ہے۔ ظالم، طاقت ور اور متعصب انسانوں کا بنایا ہوا دام خود تو دم نہیں توڑتا، مگر انسانیت کا دم اس کے جال میں پھنس کر روز بروز ٹوٹتا رہتا ہے اور پھر شفق کو لالی خوب صورت اور رنگا رنگ ہوتی ہے۔ اس میں اپنی رعنائی ہوتی ہے جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ مسحور ہو کر مسکرا اٹھتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ

اس لالی کی جنم جنم کے لئے اپنے دامن میں سمیٹ لیا جائے ، مگر انسان بہانم صفت انسان کی بخشی ہوئی لالی ، خون ظلم و غارت گری کی لالی ہوتی ہے ۔ یہ خون ، اذیت ، دکھ اور نفرت کی لالی ہوتی ہے ۔ ان سے چھٹکارا کیسے ملے ۔

صحیح یاد نہیں کہ کون سا سن تھا ۔ حکومت برطانیہ نے چند اخبارات پر ان کی ناپسندیدہ تحریروں ، یعنی تحریک آزادی ہند کی پرجوش حمایت میں لکھے گئے مضامین کی پاداش میں سنسر عائد کر دیا تھا ۔ پھر جب جنگ آزادی کے سرفروشوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر حکومت کو یہ سنسر ختم کرنا پڑا ، تو اخبارات میں جلی حروف میں یہ پیروڈی چھپی :

سنسر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس دم دشت ماضی کی خاک چھاننے کو یوں نکلی کہ جی چاہتا ہے کہ پاکستان سے اور دیگر اسلامی ممالک سے اور ساری دنیا سے مذہبی تعصب اور تشدد کا جنازہ بھی اسی دھوم اور رسوائی سے نکلے جس سے میرے بچپن میں سنسر کا نکلا تھا اور اس کی تربت کی خاک سے سیکولرزم کی کونپل پھوٹے ، ایسی کونپل جس سے ایسے جہاں کی تزئین نو ہو جہاں ہر مذہب کا تحفظ عقل و دانش اور انصاف کی بنیادوں پر ہو نہ کہ طاقت ، ہتھیار ، نفرت تعصب ، اور کوتاہ فہمی سے ۔

ایک خیال یا عقیدہ کہہ لیجئے یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے مذہب انسانوں کے درمیان کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے اور نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو مذہب انسان کے لئے اسی طرح جبلی ہے جس طرح چڑیوں میں اپنا گھونسلا بنانے کا جذبہ ۔ مذہب کا تصور اور عقیدہ انسانوں میں کیسے پیدا ہوا ؟ ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی مفر نہیں ہے کہ ملحدانہ خیالات دنیا میں زمانہ قدیم سے رائج ہیں اور موجودہ دور میں تو علمی اور سائنسی تحقیقات نے مذہبی عقائد کی عمارت کو ہلا کر رکھ

دیا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کے بارے میں آج دو قسم کے متضاد رجحانات پائے
جاتے ہیں:۔

(۱) مذہب پرستی ہر قسم کے عقلی دلائل سے ماورا ۔

(۲) الحاد کی روز افزوں مقبولیت ۔ ترقی یافتہ ممالک میں الحاد زیادہ سرعت
سے لوگوں میں پھیل رہا ہے ۔ کالج اور یونی ورسٹیاں سب سے زیادہ اس تحریک سے
متاثر ہیں، خصوصاً امریکن دل و دماغ کا سانچا اب مذہب کی بجائے الحاد کا سانچا ہے ۔
امریکی اخبار "ورلڈ" نے اب سے بہت سال پہلے تحقیقی سروے کے جو نتائج شائع کئے
تھے، ان کا لب لباب یہ ہے کہ دہریت کو عام کرنے کے لئے ملک میں منظم جماعتیں
پائی جاتی ہیں ۔ ان جماعتوں کی شاخیں مختلف کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں سرگرم
عمل ہیں ۔ نیویارک کی روچسٹر یونی ورسٹی نے سب سے پہلے الحاد کو علانیہ تسلیم کر
کے مندرجہ ذیل اصولوں کو اپنا رہبر بنایا:۔

۱۔ عقل کے سوا کوئی خدا نہیں ۔

۲۔ آسمانی کتابوں کے سارے قصے بے بنیاد ہیں ۔

۳۔ جنت دوزخ کا مادی حقیقت سے کوئی وجود نہیں ۔

۴۔ دین، فطرت سے ماورا امور کی پرستش کا نام ہے، اس لئے اسے مٹا دینا چاہیئے ۔

۵۔ کلیسائی نظام دنیا کے لئے خطرہ ہے ۔

انسانی زندگی کی ایک اہم خصوصیت کے حوالہ سے مذہب کا مطالعہ کئی
پہلوؤں سے کیا جاتا رہا ہے ۔ مثلاً نفسیاتی، عمرانی، تواریخی، افادی، معاشی وغیرہ وغیرہ
فرائڈ نے مذہب کو الوژن قرار دیا ہے ۔ اس کے نزدیک یہ ایک خیالی تصوراتی جذبہ
ہے جس سے چھٹکارہ پانا انسان کی اپنی نشوونما کے لئے لازمی ہے ۔ مذہب ایسا نظریہ
ہے جو بیک وقت خوف اور کشش دونوں جذبوں کی نشوونما کرتا ہے ۔ مزید براں
ہر مذہب کے بنیادی اصولوں پر اس سماجی کلچر کی گہری چھاپ ہوتی ہے جہاں وہ جنم

لیتا ہے۔ مذہب کے سلسلہ میں کچھ محققین کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب کے ارتقا کے آغاز میں لوگ ایک خدا پر اعتقاد رکھتے تھے اور بعد میں کئی دیوی، دیوتاؤں کا دور یا روح وغیرہ پر عقیدہ کا چکر شروع ہوا۔ جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ مذاہب میں بھی ارتقائی مراحل سے گذرنے کے بعد ایک خدا میں اعتقاد کا دور شروع ہوا۔

بہرحال دنیا کے سارے مذاہب کی فلسفیانہ قدر مشترک یہ ہے کہ حقیقت یا سچائی ہمارے احساس و ادراک سے پرے کوئی وجود رکھتی ہے۔

تہذیب و تمدن کے ارتقا میں مذہب نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہ عقیدہ کہ اپنی زندگی اور اپنی تقدیر کے لئے انسان کسی غیر مرئی طاقت پر انحصار کرتا ہے کچھ لوگوں کو معطل بنا دیتا ہے جبکہ دوسروں کو غیر معمولی ہمت اور جدوجہد کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ حیات بعد از موت کا عقیدہ کچھ لوگوں کی ساری دنیا سے بیزار کر دیتا ہے اور کچھ لوگ یہ یقین کرتے ہیں کہ یہ فانی زندگی امتحان کا وقفہ ہے۔ بنیادی طور پر مذہب ہر مادی اور بظاہر نظر آنے والی خارجی اشیا کی اصلیت سے انکار کرنا ہے، اسی لئے جب نئی مادی حقیقتیں وجود میں آتی ہیں تو مذہب انہیں تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے، چنانچہ ایک طرف تو مذہب نے تہذیب و تمدن کے ارتقا میں مثبت کردار ادا کیا ہے اور دوسری طرف اس ارتقا کے لازمی نتائج کے آگے بند باندھنے میں پیش پیش رہا ہے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا رول متضاد رہا ہے۔ مذہب اور سماجی تبدیلیوں کے مابین تواریخی لحاظ سے بڑا پیچیدہ اور متنازعہ ربط رہا ہے۔ دونوں ہی متواتر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہنے کے ساتھ ہی ایک دوسرے سے ٹکراتے بھی رہتے ہیں تواریخ کا سنجیدہ طالب علم سماجی تبدیلیوں کی رفتار میں آگے بڑھانے میں مذہب کے اہم رول کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی مذہبی رہنما اور مفکرین بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ مذہبی تعلیمات کی بنیاد میں اس زمانہ کے سماجی حالات اور شعور

کا بڑا ہاتھ رہتا ہے ۔ ہر مذہب اس دعویٰ کے باوجود کہ اس کی اقدار ازلی و ابدی ہیں ، لازماً ایک خاص ماحول اور حالات میں جنم لیتا ہے اور اس پر اپنے دور اور ماحول کی چھاپ رہتی ہے ۔ ایک متعین زمان و مکان میں جنم لینے والے مسائل کے نتیجہ کے طور پر مذاہب عالم وجود میں آتے رہے ہیں ۔

مارکس نے کہا کہ انسانی ذہن و دماغ کو مجہول کرنے میں مذہب وہی کردار ادا کرتا ہے جو افیون کرتی ہے ۔ افیون کے عادی اشخاص کے ذہن و دماغ مفلوج ہو جاتے ہیں ، سوچ و فکر کی صلاحیت معطل ہو جاتی ہے ۔ مارکس کے نقطہ نظر کے مطابق مذہب بھی یہی عمل کرتا ہے ۔ زار شاہی کے دور میں روس میں چرچ نے بعینہ یہی کیا ۔ ظلم و ناانصافی ، بھوک اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کا جوش و جذبہ ہی کسی میں جنم نہ لے سکے ، اس کے لئے عوام کو مذہب میں اندھا اعتقاد اور جنت و جہنم کے تصور سے بہلائے رکھا گیا ۔ مارکس کے جانشینوں اور کیمونسٹ انقلابیوں نے اپنی دانست میں اس نشہ کا توڑ کرنے کے لئے اسے اس معنی میں غیر قانونی قرار دے دیا کہ اجتماعی اور قومی سطح پر مذہب کے پرچار اور اس پر عمل کی تلقین پر حکم امتناعی لگ گیا ۔ یہ تو روسی عورتوں کی ہٹ دھرمی تھی جس نے کسی نہ کسی نوع کے مذہب کو گھروں کے اندر زندہ رکھ کر اس وقت تک آب یاری کی جب تک کہ اسے دوسری نسل تک منتقل نہ کر دیا اور اس پابندی کے باعث بنیاد پرستوں کو پنپنے کا خوب ہی خوب موقع ملا ۔ سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہونے سے بہت پہلے ہی سے وہاں چرچ از سر نو آباد ہونے لگے تھے ۔ مسجدوں میں کٹھ ملاؤں کے دور دورہ کا آغاز بھی ہونے لگا جو صحیح مثبت جذبہ سے یکسر عاری تھا ۔ ساتھ ہی نوجوانوں نے باقاعدہ مذہبی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور گورباچوف بڑے پریم سے پوپ سے ہاتھ ملاتے رہے اور بنیاد پرستی اور مذہبی تخریب کاری پنپتی رہی ۔ آہنی دیوار کی مدد سے حقائق

مسخ کئے جا سکتے ہیں، لیکن چھپائے نہیں جا سکتے نہ حسب منشا تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ مشرقی یورپ میں خاصے عرصہ تک مذہب نے بقول مارکس افیون کا نہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ افیون کے توڑ کا کام کیا۔ ان کی آزادی یا جمہوریت کی جدوجہد بڑی حد تک مذہبی تجدید واحیا کی تحریک کی مرہون منت کہی جا سکتی ہے۔ دیوار برلن کو یاد کرنے کے لئے پادری پہلے عبادت گاہوں میں دعا مانگنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ ایک لیتھولین پادری ۲۱ سال تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد جب مختصر سی مدت کے لئے رہا ہوا تو اس نے انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس جرم کی پاداش میں اسے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے جرم کی نوعیت یہ بتائی گئی کہ اس کے مذہبی اور انسانی حقوق کے مفروضات سوویت یونین کے نظریات سے متصادم ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اب سائنٹفک مارکسزم اور سوشلزم کے داعی بھی افیون کی باتیں کم کرتے ہیں۔ پتا نہیں یہ "آدم خاکی" کے زوال کی علامت ہے یا عروج کی۔

جانے کب وقت کو اسپ تیز رفتار کا نام دیا گیا تھا جو ماضی کو پیچھے چھوڑتا، حال کی راہوں کی دھول اڑاتا مستقبل کی جانب رواں دواں رہتا ہے کہ آج یہ اسپ تیز رفتار ہر دم بدلتی اعلیٰ ٹکنالوجی اور سائنسی انکشافات کی بدولت اندھا دھند دوڑتے دوڑتے بے دم ہو کر مستقبل کے اتھاہ سمندر میں گر پڑا ہے۔ اب زمانہ کے حوالہ سے ماضی رہ گیا ہے نہ حال۔ انسان لمحہ بہ لمحہ مستقبل میں جی رہا ہے۔ وسیع تر معنوں میں یہ اندھا دھند دوڑ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ سے لے کر آج جبکہ جلد ہی ہم بیسویں صدی کو خیرباد کہہ کر اکیسویں صدی کو خوش آمدید کہنے جا رہے ہیں، اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ حال کب ماضی میں دفن ہوا اور کب اس کی کوکھ سے مستقبل نے جنم لیا، اس کا امتیاز باقی نہیں رہا ہے۔ ہر لمحہ نئے سائنسی انکشافات، نئی

اختراعات اور اعلیٰ ترین ٹکنالوجی ۔ یہ ہیں وہ عوامل جنہوں نے زمانہ کو ماضی اور حال سے پرے مستقبل میں لا پھینکا ہے ۔ یہ ایسا دور ہے جہاں اکثر اعلیٰ ترین ٹکنالوجی بھی نئے سائنسی انکشافات و تحقیقات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے ۔ دوسری جانب چونکا دینے والی جدید ترین ٹکنالوجی کے اپنے تقاضے اور بنی نوع انسان پر اس تیز رفتار تبدیلی کا بے تحاشا دباؤ ہے ۔ چنانچہ سب سے بڑا مسئلہ گرہ کشائی کے لئے آج انسان کے سامنے یہ ہے کہ ٹکنالوجی کو کسی خضر راہ کی ضرورت ہے یا نہیں یا یوں کہیئے کہ بلامقصد تحقیق و ایجاد انسان اور انسانی معاشرہ کی فلاح کے نقطہ نظر سے کس حد تک سودمند اور قابل قبول ہے ۔

ایک دور تھا اور بہت عرصہ پہلے کی بات نہیں ہے جب ہوش ربا، تیز رفتار اور بلامقصد و جواز اعلیٰ ٹکنالوجی پر تنقید کرنے والوں کو رجعتی اور تنگ نظر کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، لیکن یہ ناقدین جن پیش آنے والے خطرات کی نشان دہی کرتے تھے، ان میں سے بیش تر اب واضح اور حقیقی روپ میں بوتل سے باہر نکلے ہوئے جن کی مانند ہمارے سامنے ہیں ۔ روز بروز یہ حقیقت شدت سے محسوس اور تسلیم کی جارہی ہے کہ اخلاقی پیمانہ یا اقدار کے بغیر ٹکنالوجی اور اختراعات انسان کو نہ پرامید مستقبل عطا کر سکتی ہیں نہ انسانیت اور نسل انسانی کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہیں ۔ مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ سائنسی تحقیقات، اعلیٰ ٹکنالوجی، ایجادات و اختراعات پر پابندی عائد کر دی جائے یا ان کی ترقی کی راہیں مسدود کر دی جائیں ۔ ٹکنالوجی کو کسی بھی اخلاقی پیمانہ سے پابند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی منزل اور مقصد اور اس کا بنیادی محرک، انسانی فلاح، انسانی جذبہ اخوت و اقدار اور اس دھرتی اور اس پر بسنے والے افراد کی خوشی اور خوش حالی کے لئے ہو ۔ سائنس اور ٹکنالوجی، ان دونوں صلاحیتوں کو آپس میں ایک مقصد کے حصول

کے لئے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشترکہ اخلاقی بنیاد بھی چاہیئے ۔ اخلاقی اقدار و معیار کا بدلتے رہنا خطرناک نہیں ہے، لیکن انسانی معاشرہ اور کلچر میں اخلاقی اقدار اور مقصدیت کا موہوم یا معدوم ہونا، یقیناً انتہائی خطرناک فعل ہے ۔ اس تلخ حقیقت کو جتنا جلد تسلیم کر لیا جائے بہتر ہو گا کہ اگر سائنس اور ہائی ٹکنالوجی کی دوڑ کو اخلاقی اقدار کی رہنمائی میسر نہ ہوئی تو جلد ہی انسانی معاشرہ کیا، سارے کرہ ارض ہی کو بحران اور تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا، لیکن حالات اتنے بھی مایوس کن اس لئے نہیں ہیں کہ اخلاقیات اور ٹکنالوجی کا ٹکراؤ، ٹکنالوجی کا اخلاقیات کو پھلانگ کر یا نظر انداز کر کے آگے نکل جانے کی سعی کوئی آج کا نیا مسئلہ یا کشمکش نہیں ہے ۔ یہ ٹکراؤ تو خاصی سنگین حد تک دو سو سال قبل صنعتی انقلاب کے بعد ہی محسوس کیا جانے لگا تھا ۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت یہ دوڑ اتنی تیز نہ تھی کہ انسان اسے کوئی اخلاقی معیار یا بنیاد کا ایک حد تک پابند نہ بنا سکتا ۔ سو آج بھی سائنس اور اعلیٰ ٹکنالوجی کی دوڑ سے کرہ ارض کے باسی بے تحاشا فائدہ اور لامحدود وسائل تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں ۔ آخر صنعتی انقلاب نے بھی تو کرہ ارض کی سطح پر قوموں کی معاشیات، سیاست، انفرادی اور اجتماعی خوش حالی میں زبردست اضافہ کیا تھا ۔ سچ تو یہ ہے کہ صنعتی انقلاب نے بجائے زوال پذیر ہونے کے، جدید سائنس اور ٹکنالوجی کو بنیاد فراہم کی ۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اب ہمارے پاس اتنی مہلت نہیں ہے کہ ہم بلامقصد، بلاجواز اور بغیر کسی اخلاقی رہنمائی اور نشان منزل کے تحقیق و ایجاد میں اپنی انرجی، صلاحیت، سائنس اور وسائل کا زیاں کر کے بنی نوع انسان کو نت نئے مصائب کا نشانہ بنائیں ۔ مصائب کی بات اس لئے کہی گئی کہ باوجود سارے جدید سامان تعیش کے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے منجمد جنین اور پیوند کاری، نئی نئی اقسام

کے ذی روح کی تخلیق میں خاصی کامیابی کے باوجود تیسری دنیا اور پس ماندہ ممالک کے عوام، جوان، بچے اور بوڑھے بھوک اور افلاس کے علاوہ نت نئے تمدن کی دین بیماریوں سے سسک رہے ہیں اور ایڑیاں رگڑ کر مر رہے ہیں، مفلوج اور نابینا ہو رہے ہیں، معذور اور ذہنی طور پر پس ماندہ پیدا ہو رہے ہیں۔ بے روزگاری اور افلاس سے مجبور ہو کر مائیں اپنے پیٹ کے بچہ کو سائنس اور ہائی ٹک کے تجربہ کے لئے چار پیسوں کی خاطر بلامقصد تحقیق و ایجاد کے جنونیوں کے ہاتھوں بیچ رہی ہیں۔

انسانیت کا سودا کرنے والے اس قسم کی تحقیق و اختراع میں سرگرداں وہ افراد اور دولت مند عالمی کمپنیاں ہیں جن کے دلوں میں انسانیت کا نہیں بلکہ خود امر ہو جانے اور لامحدود شہرت و دولت کمانے کا سودا سمایا ہوا ہے۔ کرہ ارض کے باسیوں کو اکیسویں صدی کے آغاز میں ہائی ٹکنالوجی اور سائنس کی بلامقصد اور نیک و بد کی تمیز کے بغیر اس دوڑ کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی، اس کا اندازہ پچھلے دو عشروں کا سرسری جائزہ اور موجودہ عشرہ میں جھانک کر لگایا جا سکتا ہے۔

آج بے شک انسان محیر العقل طور پر، اسرار فطرت کی گرہ کشائی کر رہا ہے، لیکن اس کارگذاری کے انجام دینے میں کتنی اخلاقی اور انسانی اقدار سے روگردانی کرنی پڑتی ہے، کتنی بے دردی سے نسل کشی کو اپنا شعار بنانا پڑتا ہے اور فضا اور ماحول کو آلودہ کرنا پڑتا ہے، یہ غور و فکر کا مقام ہے۔ سائنس اور اس پر منحصر ایجادات و انکشافات نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ زمیں و آسمان، ماحول و فضا اور نظام شمسی ہی کے نہیں بلکہ انسان حیات و نمو کے اسرار آشکار کر چلا ہے۔ اتنے ہی پر بس نہیں ہے بلکہ اب وہ حیاتیاتی جوہر کی فطرت و ماہیت میں حسب منشا تبدیلی کر سکتا ہے اور نئی اقسام کے ذی روح پیوند کاری کے ذریعہ بنا سکتا ہے۔ رازہائے فطرت اور قوانین فطرت سے نبرد آزما ہو کر انہیں تسخیر کرنے، ان پر فتح یاب ہونے

والی انسانی ذہانت و ذکاوت کی محیر العقل اور لامحدود عظیم الشان صلاحیتوں کے آگے سر تو جھکانا ہی پڑے گا، لیکن ذرا یہ تو دیکھیں کہ انسان نے ان ساری کاوشوں اور جاں فشانی سے حاصل کی ہوئی فتوحات سے کیا کھویا کیا پایا۔ مادر گیتی اور اس پر بسنے والی مخلوقات اور ان سے بہت پرے کائنات پر فتح اور ان کی تسخیر کے عمل پر بغلیں بجانے سے پہلے ذرا یہ تو دیکھیں کہ تحقیق و انکشاف، ایجاد و اختراع کی اس صلاحیت نے ہمیں کارزار زیست کے کس کنارے لاکھڑا کیا ہے۔ آج ٹکنالوجی نیچر یا فطرت سے براہ راست برسرپیکار ہے، لیکن عام انسان کو انسانیت کے گم کردہ راہی، ظلم، تشدد و نفرت، فضا کی کثافت اور آلودگی اور نت نئی بھیانک بیماریوں کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں لگا ہے۔ کثافت انسان کے رویہ اور طرز عمل میں اور کثافت، ماحول اور فضا میں۔ گرمی سے بچاؤ کے لئے ایر کنڈیشن (مٹھی بھر افراد کو) میسر ہو گئے، لیکن اوزون (O-ZONE) کی چادر تو باریک سے باریک تر ہی ہوتی جا رہی ہے۔ دعویٰ یہ ہے اور سچ ہی ہے کہ انسان کی اوسط عمر دراز ہو گئی ہے، لیکن اس درازی عمر کے نتیجہ میں جو ضعیف العمر معذور افراد کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور ان کی دیکھ بھال کا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے، وہ سنگین صورت میں خود یورپ اور امریکا میں درپیش ہے۔ غریب ممالک کا تو ذکر ہی کیا۔

مصنوعی انسان گڑھنے والے اصلی انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خائف اور کنٹرول کرنے سے لاچار ہیں کہ یہ لوگ نہ تو آبادی کے اضافہ کو اپنی ٹکنالوجی کی مدد سے روک سکے ہیں نہ دنیا کی آبادی کے دو تہائی انسانوں کی تعداد کو بھوک افلاس جہالت، بیماری اور بے روزگاری سے نجات دلا کر سائنس اور اس کی ایجادات کی برکتوں سے فیض یاب کر سکے ہیں۔ عقل انسانی سے ماورا کارنامے تو انجام دیئے جا رہے ہیں، لیکن یہ عقل و دانش ان کے حصول سے باہر ہو گئی ہے کہ کیا کرنا بنی

نوع انسان کے مفاد میں ہے اور کون سی اختراع اسے تباہی کی جانب لے جا رہی ہے یعنی کون سی ایجاد اور کس نوع کا سائنسی تجربہ مناسب اور انسان کی بہبود کی خاطر ہے اور کیا چیز اس کے لئے نقصان دہ اور سراسر گھاٹے کا سودا۔

آج تو صورت حال یہ ہے کہ تبدیلی اتنی تیزی سے ظہور پذیر ہو رہی ہے کہ اب ہمیں انسان اور انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے رک کر سوچنے کی مہلت ہی نہیں ہے۔ ہم بلامقصد و جواز ایک دوڑ کا حصہ بن کر بلا نشان منزل، تغیر اور تبدیلی کے نقطہ پر منجمد ہو کر رہ گئے ہیں۔ تبدیلی کا یہ جمود بقائے انسانی کی خاطر توڑنا ضروری ہے۔ بصورت دیگر اکیسویں صدی شاید فطری طور وجود میں آئے ہوئے انسان کے سفر کی آخری صدی نہ ثابت ہو، چنانچہ اب ہم ٹکنالوجی اور سائنسی انکشافات کی ترقی کے اس مقام پر آگئے ہیں جہاں رک کر یہ سوچنا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، کس منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں، یہ نئی دنیا اور سائنسی ذی روح، جو ہم تخلیق کر رہے ہیں، کیا اور کیسی ہو گی۔

آج کی ٹکنالوجی، تجربات اور انکشافات، جو اس کرہ ارض پر بسنے والوں کے ساتھ ساتھ پوری فضا اور شاید فضا سے ماورا پوری کائنات کو اپنے حصار میں لے کر آلودہ کر رہی ہے، اس کے سامنے صحیح غلط، اچھے برے، مفید اور مضر، اخلاقی اور غیر اخلاقی جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، لیکن کرہ ارض کا مستقبل اور بقا داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اس میں شک کی کم گنجائش ہے۔ سائنس داں، ڈاکٹر، فلسفی، ماہرین تعلیم، ادیب، دانش ور اور ہر طبقہ فکر و فن سے تعلق رکھنے والے کو سوچنا اور اس بھیانک صورت حال سے نپٹنے کی راہ ڈھونڈنا ہے، بیسویں صدی کے اس اختتامی عشرہ میں مفقود نشان منزل کا کھوج لگانا ہے۔ ٹکنالوجی میں تبدیلیاں اتنی تیزی سے آرہی ہیں کہ کسی کو فرصت ہی نہیں ہے کہ رک کر اقدار کے بارے میں سوچ سکے۔ نئی ایجادات

واختراعات کے فوائد اور ان کی قدر و قیمت پر غور کر سکے۔ ویسے آج ٹکنالوجی کی دوڑ کو کم کرنا یا اس میں بریک لگانا آسان بھی نہیں ہے۔ صنعتی سائنسی دنیا سے لے کر سیاست اور فوج ہر جگہ مفاد پرست طبقہ چھایا ہوا ہے۔ سرمایہ، منافع اور ٹکنالوجی کا زبردست گٹھ جوڑ ہے۔ انسانوں کا عظیم حصہ اس گٹھ جوڑ کی زد میں ہے، لیکن اسے اخلاقی اقدار اور انسانی فلاح کو ٹکنالوجی کی راہ میں لانے کی ہمت نہیں ہے جبکہ انسانی بقا کا دار و مدار اس پر ہے کہ دھرتی کے باسی اس گٹھ جوڑ سے مطالبہ کریں کہ بس! بہت ہوا۔ اب ہمیں ٹکنالوجی نہیں بلکہ اخلاقیات (ETHICS) کی ضرورت ہے۔ جو سرمایہ (ایجادات کی شکل میں) ٹکنالوجی کی مدد سے حاصل ہوا ہے، اب اسے اخلاقیات (ETHICS) کی مدد سے اور اقدار کی مدد سے فلاح انسانی کے لئے مصرف میں لانے کا وقت ہے کہ بلا مقصد دوڑ سے زیاں ہی زیاں ہے۔

# ہائی ٹک اور سائنس کی غیر ذمہ دارانہ شعبدہ بازی

آج کے اعلیٰ ٹکنالوجی اور سائنسی انکشافات کے دور میں ہر سوچنے سمجھنے والا اور ذاتی مفادات سے بالاتر فرد اس سوالیہ نشان کا جواب تلاش کرنے میں سرگرداں ہے کہ کس طرح ٹکنالوجی کے اس دور کو کچھ بریک لگا کر انسانی ذہانت و صلاحیت کو VALUE BASED ایجادات و اختراعات اور تحقیق کی جانب مائل کیا جائے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ معروضی حالات اور مطالبات زندگی جس سرعت سے بڑھ رہے ہیں اور تبدیل ہو رہے ہیں، انسانی نفسیات ان کا ساتھ اسی تیزی سے نہیں دے سکتی۔ ٹکنالوجی، تحقیق اور سرمایہ کے گٹھ جوڑ کو اپنی ایجادات، منافع، تحقیق اور ریسرچ کی دنیا میں نام امر کرنے کے علاوہ اور کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا پروگرام مرتب نہیں ہو پاتا کہ لوگ نئے حالات سے سمجھوتا کر سکیں چنانچہ آج کل ہر شخص سے سن لیجئے کہ ڈیپریشن بہت ہو رہا ہے۔ ڈیپریشن، فرسٹریشن اور اسٹریس نے ننھے ننھے بچوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں، جو بظاہر بے ضرر اور خوشیوں کی ضامن لگتی ہیں، انسان کے بچہ بچہ کو فرسٹریشن اور احساس محرومی کی جانب لے جا کر اسے تباہ کر رہی ہیں۔ ٹی۔ وی۔ سے ہم رنگین ٹی۔ وی۔، ریڈیو ویڈیو گیمز، کمپیوٹر اور کمپیوٹر گیم کے دور میں آئے۔ ہر نئی ایجاد بچوں اور بڑوں کے لئے کم از کم ابتدا میں فرسٹریشن کا نیا پیغام لے کر آتی ہے۔ یہ دور عارضی صرف ان لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو صاحب استطاعت ہیں۔ غریب طبقہ کے لئے روٹی کی قیمت کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں محرومی بھی بڑھتی رہتی ہے۔

لوگوں تک نئی ایجادات کی معلومات اتنی جلدی اور تیزی سے پہنچتی ہیں کہ دماغ الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس غیر معمولی اور تیز رفتار دور کی تبدیلیوں سے سمجھوتا

کرنے کے لئے روایاتی طرز کی سوچ اور فکر کی مدد سے فیصلہ اور لائحہ عمل نہیں اپنایا جا سکتا، لیکن انسان خاموش تماشائی بھی تو نہیں رہ سکتا نہ یہ مسئلہ کا کوئی حل ہے۔ یہ فیصلہ تو کرنا ہی ہو گا کہ سائنس کی ایجادات میں ہر لمحہ انقلاب کی ضرورت ہے یا ارتقا کی۔ پھر یہ کہ اختراع و ایجاد کسی اصول اور ETHICS کے پابند ہوں یا نہ ہوں، ایسی اختراع، جو انسانی معاشرہ کے اپنائے ہوئے انداز کی چولیں ہلا دے، اس میں عوام کی رائے اور منشا کا شامل ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم سیاست میں جمہوریت کے خواہاں ہیں تو زندگی کے کلیدی مسائل کے حل کرنے میں جمہوریت کو کیوں نکال پھینکیں۔ آج بہت سے سیاست داں جو سائنسی اختراعات کی سیاسی سرپرستی کرتے ہیں یا تو انہیں اندازہ نہیں ہوتا کہ بنی نوع انسان کے ساتھ وہ کتنا بھیانک کھیل کھیل رہے ہیں یا جدید ٹکنالوجی کی پیچیدگیوں اور اس کے مضمرات کی انہیں اپنے سیاسی مستقبل کے آگے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اگر ایک اچٹتی ہوئی نظر ہم موجودہ صورت حال اور ان سے پیدا شدہ نئے مسائل پر ڈالیں تو پتا چلے گا کہ انسان نے جن مشکلات اور مصائب کا آغاز تمدن سے سامنا کیا ہے، آج ان میں کمی کی بجائے بے تحاشا زیادتی ہوئی ہے۔

**آبادی:** آبادی میں موجود وسائل کے تناسب سے بڑھ کر اضافہ کوئی آج کا نیا مسئلہ نہیں ہے۔ اسی اضافہ کے خطرہ کے پیش نظر مالتھس نے ۱۷۹۸ء میں پیشینگوئی کی تھی:

"MAN IS SITTING ON A DEMOGRAPHIC TIME BOMB."

مالتھس کے اپنے نظریہ کے مطابق ایسا وقت آنے والا تھا جب دنیا کی آبادی اس کے غذائی وسائل سے بڑھ جائے گی۔ لوگ بھوک اور بھوک سے جنم لینے والے امراض میں مبتلا ہو کر موت کا شکار ہوں گے تاوقتیکہ انسانوں کی تعداد میں اتنی کمی ہو جائے

کہ آبادی اور غذائی رسد میں کچھ توازن پیدا ہو جائے اور یہ چکریوں ہی چلتا رہے گا۔ مالتھس نے انسانی آبادی اور زمینی وسائل سے متعلق یہ سیدھا سادہ نظریہ اس وقت پیش کیا جبکہ آج کی ٹکنک اور سائنسی معلومات کا وجود نہ تھا۔ آج مالتھس کو مضحکہ خیز انداز میں تنقید کا نشانہ بنا کر اس کے نظریہ کو باطل ثابت کیا جاتا ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق مبصرین کا اندازہ ہے کہ پورے کرہ ارض کی جتنی آبادی ۱۸۳۰ء میں تھی، کم و بیش اتنی ہی تعداد کا اضافہ ۲۱ ویں صدی کی پہلی دہائی کے آغاز تک ہو جائے گا۔ آبادی میں یہ دھماکا خیز اضافہ نئے نئے مسائل اور تقاضوں کو جنم دے گا۔ ابھی یہ حالت ہے کہ آبادی موجودہ وسائل کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہو چکی ہے، اب اگر صرف چند سالوں میں مزید ایک بلین کا اضافہ ہو جائے تو اس غریب کرہ ارض کا، جسے ہم مادر گیتی کہتے ہیں، کیا حشر ہو گا؟ اس غریب کی پیٹھ تو پہلے ہی طرح طرح کے خود انسان کے پیدا کردہ بوجھ سے جھک چکی ہے۔

دنیا کی ہیئت بدلے گی سو بدلے ہی گی بظاہر لاینحل سوال یہ ہے کہ جدید تمدن کے تقاضوں کے مطابق اس بڑھی ہوئی آبادی کے کرائسس سے کیسے نپٹا جائے مرے پر سو درے یہ کہ اس پوری ارضی آبادی کا ۸۰ فی صد ترقی پذیر یا پس ماندہ ممالک کے باسی ہوں گے۔ صنعتی مغربی ممالک کی آبادی دنیا کی عمومی آبادی کا صرف بیس فی صد ہو گی۔ مزہ کی بات یہ ہے کہ دنیا کی غذائی اور دوسری ضروری اشیا کا اسی فی صد حصہ بیس فی صد والے ممالک اور .... بیس فی صد اسی فی صد آبادی والے ممالک کا مقسوم ہو گا۔

COMPUTERISED معلومات سے کام کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ محنت کش انسان بے روزگار ہو رہا ہے اور مشینی انسان برسرروزگار۔ تحقیق و جستجو، سائنس، ہائی ٹک اور سرمایہ کا گٹھ جوڑ جب تک سلامت ہے، یہی

صورت حال رہے گی۔ بے شک معاشرتی تبدیلیاں صنعتی انقلاب کی مانند ہمہ گیر اور ہم پلہ ہیں، لیکن جب تک کہ انسانی مفاد اور بہتر مستقبل کا کوئی جامع پروگرام اور منزل نہ ہو، یہ معاشرتی تبدیلیاں تباہ کن ہی ثابت ہوں گی۔

صرف چند عشرے پہلے انسان نئے ذی روح بنا سکتا ہے، یہ دعویٰ سائنس فکشن لگتا تھا۔ آج یہ فکشن حقیقت کا روپ دھارے کھڑا ہے کہ امریکا میں تکنیکی سائنس کی مرہون منت تقریباً اکیس نئی اقسام جانوروں کی پیوند کاری کے ذریعہ پیدا کی جا چکی ہیں اور یہ ٹیسٹ ٹیوب اور FROZEN EMBRYOS سے جنم لئے ہوئے انسان بھی کیا فطری انسان کہے جا سکتے ہیں؟ لیکن ابتدائی سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ساری اخلاقیات، ساری ETHICS اور صحیح غلط کے سارے تصورات کو بالائے طاق رکھ کر کیا اس مسئلہ کو ہائی ٹک اور سائنس کی مدد سے بآسانی حل کیا جا سکتا ہے، مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا آج سائنس اور ٹکنک کو انسانوں کو ضروریات زندگی مہیا کرنے یا ان کی فلاح سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ زراعتی پیداوار میں حسب ضرورت اضافہ اور ان کی صحیح تقسیم کوئی ناممکن عمل نہیں ہے۔ اگر میڈیکل سائنس پیوند کاری، ٹیسٹ ٹیوب بے بی، منجمد جنین حیاتیاتی جوہر میں دخل اندازی کر کے نئی اقسام کے ذی روح حیوانات بنا سکتا ہے تو زراعت میں حسب ضرورت ترقی کیوں نہیں ہو سکتی؟

آبادی میں بے تحاشا اضافہ سے زمین کی ECOLOGY پر زبردست دباؤ پڑ رہا ہے، چنانچہ ماحول اور فضا کی آلودگی کم کرنے کی بجائے روز بروز ان میں زیادتی ہو رہی ہے۔ نئی بیماریاں پیدا ہونے سے پہلے انسان کو چمٹ رہی ہیں۔

**بے روزگاری:** بے روزگاری دور جدید کی ایک نئی دین ہے۔ کمپیوٹر اور روبوٹ کی شکل میں محنت کرنے والوں کو ایک نئے مشینی انسان سے مقابلہ ہے۔

جیتے جاگتے فطری انسان اس نئے ٹکنالوجیکل انسان کے ساتھ دوڑ میں ساتھ دینے سے قاصر ہیں ۔ انسان نے کیا پایا جس کی تسخیر کے لئے یہ کائنات بنائی گئی ۔ کیا آبادی کا مسئلہ حل ہو گیا ، روٹی کپڑے اور مکان کی ضرورتیں پوری ہو گئیں ؟ کیا اسے جان و مال کا بہتر تحفظ ، تشدد اور جرائم سے چھٹکارا ملا ، کیا اسے بیماریوں سے بچاؤ میسر ہوا یا نئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا ؟ کیا خود غرضی ، لالچ ، لوٹ مار ، استحصال اور جنگ و جدال میں کوئی کمی ہو گئی ؟ کیا فرقہ پرستی ، نسل پرستی ، مذہبی تعصب اور بے انصافی ختم ہو گئی ؟ زمین کی زرخیزی میں سائنس کی مدد سے اضافہ کرکے کیا انسان کو خشک سالی اور قحط سے نجات مل گئی ؟ کیا سارے اخلاقی اور جنسی بندھنوں کو توڑ کر FREE SEX اور SAFE SEX کا پرچار کرنے والوں نے ایڈز ، جو نئے دور کی دین ہے ، کی لعنت ختم کر دی ؟ اگر ان میں سے ایک سوال کا جواب بھی اثبات میں مل سکے تو ہم سمجھیں گے کہ ہائی ٹک اور سائنس نے انسان کو بلندی اور نجات کی معراج پر لا کھڑا کیا ہے ۔

ٹکنالوجی کی دوڑ پر لکھتے لکھتے ہمیں یاد آیا کہ بہت دنوں سے جاپان دیکھنے کی تمنا تھی ، سو آخر یہ تمنا بھی بر آئی اور ہم نے جاپان بھی دیکھ ہی ڈالا اگرچہ بہت ہی قلیل وقت میں ۔ ہماری جاپان کی سیاحت سے ہمارے قارئین کو فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ، لیکن ہمیں تو دو ، دو دشت کی صحرا نوردی ہاتھ لگی ۔ جیتی جاگتی جدید دنیا بھی دیکھ لی اور ماضی میں دفن حسین بچپن بھی اور یہ ایسے ہوا کہ ٹکنالوجی کی دوڑ کے متعلق لکھتے لکھتے ہمیں یاد آیا کہ عرصہ گذرا جب ہم بچہ تھے اور ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے ، ہمارے اسکول میں ایک مباحثہ ہوا تھا جس کا موضوع تھا " کیا سائنس کی ایجادات انسان کے لئے فائدہ مند ہیں ؟ " ہمیں موضوع کے خلاف بولنا تھا ۔ یہ آج سے کوئی پچپن سال پہلے کی بات ہے جب آج کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو سائنس

کی ترقی اور سائنسی ایجادات اپنے عہد طفلی میں تھیں ۔ ابھی تو لوگ صنعتی انقلاب کے اثرات کے سحر سے بھی آزادانہ ہو پائے تھے ۔ ریل گاڑیوں موٹر کاروں ، بجلی کے پنکھوں وغیرہ کے علاوہ سائنس کی ایجادات کے خلاف بولنے کو صرف یہی تھا کہ مشینوں کے ذریعہ چونکہ پیداوار نسبتاً تیز ہوتی ہے ، اس لئے بہت سے لوگ بے روزگار ہو جاتے ہیں ۔ برطانیہ نے ہندوستان کو مشین کا بنا کپڑا درآمد کرنا شروع کیا تو ہندوستان کے بے تحاشا کاریگر بے روزگار ہو گئے ۔ اسی لئے گاندھی جی نے ہندوستان میں چرخہ مہم چلائی ۔ لوگوں کو کھدر پہننے کا پرچار کانگریس نے کیا کہ گھروں میں چرخہ اور کھڈی پر سوت کاتنے والے اور کپڑا بننے والے محنت کش برطانیہ کی مشینوں پر بنے ہوئے کپڑوں کی درآمد سے بے روزگار ہو رہے تھے ۔ خیر! کھدر مہم کا تو اپنا سیاسی پس منظر، نو آبادیاتی نظام کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج اور جدوجہد آزادی کا جذبہ بھی تھا ، لیکن سائنس کی ترقی اور ایجادات کے خلاف اسکول کے اسٹیج سے بولتے ہوئے اپنے دلائل کی مضحکہ خیزی کا ہمیں تب شدت سے احساس ہو رہا تھا ۔ بھلا سائنس نے لوگوں کو بے روزگار کیسے کیا! اتنے سارے نئے نئے سامان جو ، سائنس کی مدد سے مشینوں سے تیار ہوتے ہیں ، ان سے تو لوگوں کی روزی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور پھر یہ آرام و آسائش کی نت نئی سہولتیں!

آج عرصہ بعد جبکہ سائنس اور انسان نے ان پچپن برسوں میں پچپن صدیوں سے بھی زیادہ کی مسافت طے کر لی ہے ، جاپان کی حقوق نسواں کی حامی نوجوان تعلیم یافتہ لڑکیوں کی ایک انجمن نے OFFICE AUTOMOTION مشینوں پر سخت اعتراض کیا ہے ۔ انہوں نے قوم کے سامنے اور عالمی برادری کے سامنے یہ سوال اٹھایا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی بے محابا آگے بڑھتی ہوئی ہر کس کے مفاد میں ہے ، عوام کے یا سرمایہ داروں کے یا انسانوں کے اس طبقہ کے جنہیں تحقیق و

ایجاد کی ہابی ہے اور یہ ہابی جنون کی حد تک پہنچ گئی ہے؟ یہ جان کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی ہوئی کہ ان صابر و شاکر روایات کی اسیر جاپانی عورتوں کی نوجوان لڑکیوں میں یہ سوچ کہاں سے آگئی جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آج بھی صرف معمولی کام یا چائے پانی سے لوگوں کی تواضع پر مجبور ہیں۔

جاپان میں تقریباً ۹۰ فی صد کمپنیوں نے اپنے آفس میں خود کار مشینیں نصب کر لی ہیں، یعنی آفس کے سارے کام مکمل طور پر آٹو میٹک ہو گئے ہیں اور انسانی ہاتھوں کی ضرورت نفی کے برابر رہ گئی ہے۔ اس صدی کے ختم ہونے تک اندازہ ہے کہ سارے آفس خودکار ہو جائیں گے۔ آٹو میٹک آفس سے دفتری کاروبار میں زبردست انقلاب آگیا ہے۔ یہ انقلاب ظاہر ہے صرف جاپان کے لئے نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر ملک میں AUTOMATIC مشینیں تیزی سے انسانوں کی جگہ لے رہی ہیں۔ بظاہر تو اس دفتری انقلاب اور عورت کے مفاد میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا، لیکن صورت حال کا تھوڑا سا تجزیہ کرنے سے یہ تضاد واضح ہو جائے گا اور یہ بھی کہ صنعتی انقلاب کے بعد عرصہ تک سائنسی تحقیقات و ایجادات کے سود مند یا غیر سود مند ہونے پر جو مباحثہ چلا تھا، وہ جاپان میں دفتری انقلاب کے بعد عمومی طور پر محنت کشوں اور خصوصی طور پر جاپان کی عورتوں کا مسئلہ کیوں بن کر رہ گیا ہے اور چونکہ دنیا کے محنت کشوں کی مانند دنیا کی عورتوں کو بھی مشترکہ مسائل مشترکہ کوششوں سے حل کرنا ہوں گے، اس لئے OFFICE AUTOMOTIONS کا مسئلہ عالمی سطح پر عورتوں کا مسئلہ ہے۔ یہ ہر عورتوں کے طبقہ کو سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ تباہی، بے روزگاری اور ذہنی دباؤ کی جانب لے جا رہی ہے باوجود اس امر کے کہ ایک حلقہ اس بات پر بغلیں بجا رہا ہے کہ کمیونزم ختم ہو گیا، چنانچہ محنت کش کی طاقت اور اتحاد کا مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔

جاپان میں محنت کشوں میں عورت کا تناسب تقریباً ایک تہائی ہے ۔ آفس میں کام کرنے کا روایاتی انداز بدل گیا ہے ۔ مثلاً بہی کھاتے میں حساب کتاب یا ٹائپنگ کی جگہ ذاتی کمپیوٹر نے لے لی ہے ۔ ایک طرف کمپیوٹر کا بٹن دبانا پڑتا ہے دوسری جانب ٹی ۔ وی ۔ پر دھیان سے نظریں جمائے رکھنی پڑتی ہیں ۔ جو لوگ خودکار دفتری مشین استعمال کرتے ہیں ، ان کی محنت کی کارکردگی سے لے کر ان کی صحت ، روزگار کی شرائط یہاں تک کہ ان کی روزمرہ کی گھریلو زندگی بھی متاثر ہوتی ہے اور اس سارے خودکار نظام کا منفی اثر زیادہ تر عورتوں پر پڑتا ہے ۔

خودکار دفاتر خاص طور پر عورتوں کے لئے کس طرح مضرت رساں ہیں ، ایک مثال سے واضح ہو جائے گا ۔ ان دفتروں میں سارا کام آٹو میٹک مشین کے ذریعہ ہوتا ہے ۔ ہاتھ سے لکھنے کا کام ختم ۔ ڈاکومنٹ اور معاہدے تک ان مشینوں میں ڈرافٹ ہو جاتے ہیں ۔ ساری معلومات مشینوں کے ذریعہ دستیاب ۔ حساب کتاب کے رجسٹری اندراج کے لئے نام نہاد لوگوں کی ضرورت باقی رہ گئی ہے ۔ مشین کے تقریباً مکمل دخل اندازی سے دفتری کاموں کی کارکردگی بہتر اور تیز تو ضرور ہو گئی ہے ، لیکن بے تحاشا دوسرے سنگین مسائل ابھر رہے ہیں ۔ خودکار مشینوں ، کمپیوٹر اور ٹی ۔ وی ۔ پر گھنٹوں کام کرتے کرتے عورتوں کی بصارت اور عام صحت پر بہت مضر اثر پڑتا ہے اور شدید سر درد اور مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے ۔

جاپانی عورتوں کا کہنا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ دفتروں کی خودکارکردگی سے پیداواری مصارف میں کمی تو ضرور ہوتی ہے ، لیکن اس کمی کا فائدہ عام لوگوں کو بہت کم ہوتا ہے اور محنت کش عوام کے ہاتھ (بے روزگاری اور مضر صحت اثرات) آنے کو صرف گھاٹے کا سودا رہ جاتا ہے ، چنانچہ ان کا مطالبہ ہے کہ محنت کش اور مشینی خودکارکردگی کو اپنانے میں سرمایہ دار کے ساتھ محنت کش کے مفاد کو بھی

مدنظر رکھتے ہوئے اوقات کار کم کیئے جائیں تاکہ کسی حد تک بے روزگاری کا مداوا ہو سکے اور صحت پر مضر اثرات نہ پڑیں۔

جاپان میں عام طور سے کسی بڑے سے بڑے دفتر میں چلے جائیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانوں کی دنیا سے کٹ کر کسی دوسرے ہی سیارے میں آگئے ہیں جہاں لوہے کی مخلوق بستی ہے۔ کام کرتے ہوئے بس اکا دکا انسان پر ہی نظر پڑتی ہے اور جو انسان کام کرتے ہوئے نظر آتے بھی ہیں، ان کی حالت زار پر ترس آتا ہے کہ کس طرح یہ بے چارے گھنٹوں اور متواتر ایک ہی عمل کو دوہرائے جاتے ہیں۔ اس طرح کام کرنے والوں کو نہ تو کام سے کوئی دل چسپی پیدا ہو پاتی ہے اور نہ آگے بڑھنے کے لئے نیا تجربہ حاصل کرنے گنجائش یا موقع ملتا ہے۔ بس بہت ساری دھات کی بنی مشینوں کے درمیان ایک گوشت پوست کی بنی مشین سمجھ لیجئے۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی مشین ہم نے اس لئے کہا کہ انہیں کام کے دوران نہ تو اپنا ذہن اور سوچ و فکر کی صلاحیت استعمال کرنی ہوتی ہے، نہ ہاتھ کے استعمال کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

خودکار مشینوں کے استعمال سے انسانی محنت کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے اور جب چھانٹی ہوتی ہے تو عورتیں پہلے اس چھانٹی کی زد میں آتی ہیں۔ ایک ایسا ملک جو صنعتی ترقی اور اعلیٰ ترین ٹکنالوجی میں دنیا کے بیش تر ممالک سے آگے ہے۔ جہاں کی تعلیم یافتہ نئی نسل کی خواتین بلاجواز طلاق، اسقاط حمل، جنسی آزادی اور LESBIAN حقوق کا مطالبہ نہیں کر رہی ہیں۔ اگر وہاں کی عورتیں OFFICE AUTOMOTION اور اس طرح کی دوسری ٹکنالوجی کے سلسلے میں آواز بلند کرتی ہیں تو یقیناً معاملہ حد سے زیادہ گمبھیر اور مسائل تشویش ناک ہیں۔

خواتین اور وہاں کی ٹکنالوجیکل ترقی دیکھ کر جو تاثر لیا۔ وہ یہ تھا کہ جاپان کو

تضادات کی سرزمین کہنا غلط نہ ہو گا۔ جتنی سرعت کے ساتھ ان کے یہاں تبدیلی آتی ہے، اتنی ہی زیادہ سختی کے ساتھ یہ اپنی روایات سے چمٹے رہتے ہیں۔ اسی طرح جاپانی کلچر کے دو روپ ہیں۔ ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ روایات اور رسم و رواج پر سختی سے کاربند رہنا جاپانی کلچر کا اندرونی پہلو ہے۔ یہ کسی قیمت پر بھی رسم و رواج کو پامال ہونے نہیں دینا چاہتے۔ شاید اسی لئے یہ غیر ملکیوں سے زیادہ راہ و رسم نہیں بڑھاتے اور دوسرے بہت سے ممالک کے برخلاف جاپان میں امیگریشن کا سلسلہ بھی بہت محدود ہے۔ ویسے ملنے جلنے میں جاپانی بہت شائستہ اور نرم گفتار ہیں۔ تضادات کے ساتھ سمجھوتا کرنا انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیت سے خوب جانتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں ہزیمت کھانے کے بعد سے اب تک امن اور عدم تشدد کی پالیسی پر کاربند ہیں، حالانکہ ایک تخمینہ کے مطابق ان کے فوجی اخراجات عالمی معیار سے چھٹے نمبر پر آتے ہیں۔ پھر ایک طرف تو اعلیٰ ترین ٹکنالوجی کے ماہر ہیں اور صنعتی ترقی، سائنس اور ٹکنالوجی کی ایجادات میں بہت سارے سورماؤں کو مات دے چکے ہیں تو دوسری طرف گھریلو زندگی میں اور اخلاقی و معاشرتی اقدار میں زیادہ تر لکیر کے فقیر ہی بنے ہوئے ہیں اور ان کی سماجی اور گھریلو طرز رہائش اور انداز فکر دیکھ کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ساری ترقی اور خوشحالی نے عورتوں کی صنف کو کیا دیا ہے یا ان کی جاگیرتی میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

ہم وہاں رہے اور چند مقامی لوگوں کے توسط سے جاپانی عورتوں کی خاصی تعداد سے ملے۔ ان کا تعلق مختلف طبقات، پیشوں اور مراتب سے تھا، لیکن ہمیں عورتوں کی کوئی قابل ذکر تحریک یا تنظیم کے موجود ہونے کا اندازہ نہ ہوا۔ ویسے خواتین کی انجمنیں تو بہت ساری ہیں، لیکن مغرب کی FEMINIST تحریک تو دور کی بات ہے، منظم طور پر حقوق کے حصول کا شعور بھی جنم نہیں لے پایا ہے۔ ویسے

لباس کی حد تک تو جاپان کی نئی نسل نے مشرق سے مغرب کا خاصا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ ریشمی کمانو کے جھول سے نکل کر مغربی طرز کے بزنس سوٹ اور ڈریس اپنا لئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی کہا کہ سماجی طور طریقے اور پابندیاں جوں کی توں ہیں اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے کہ پچھلے ۴۰ سال کے عرصہ میں جاپان ایک شکست خوردہ قوم سے ترقی کر کے معاشی طور پر عظیم ترین طاقت کی حیثیت سے ابھرا ہے، لیکن جاپانی عورتوں نے فرسودہ پابندیوں سے کس حد تک نجات حاصل کی ہے اس کا سروے کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی عورتوں کی بڑی اکثریت کے لئے جاپان کا عظیم الشان صنعتی مقام یا HI-TECH میں قیادت، ان کی زندگی میں کوئی حقیقی انقلاب تو کیا، تبدیلی بھی نہیں لا سکا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی وہ ابھی پس ماندہ ہیں۔ یہ احساس بھی بہت کم عورتوں میں ہے کہ انہیں اپنے آپ کو بدلنا ہے۔

ہم تقریباً دو سو عورتوں سے ملے جس میں زیادہ تر نئی نسل اور ادھیڑ عمر کی عورتیں تھیں۔ زیادہ عمر کی عورتوں سے موجودہ رجحان کا اندازہ لگانا مشکل ہو گا، کیونکہ بہرحال وہ جتنا بھی رجعت پرست ہوتیں، تعجب کی بات نہ تھی۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ تقریباً ۳۰ فی صد کا پختہ خیال ہے کہ عورتیں دماغی اور ذہنی صلاحیت میں مردوں سے کم تر نہیں۔ ویسے بہت سی خواتین اس معنی میں صحت مند اور اعتدال پسند ہیں کہ وہ عورتوں کو مردوں سے دماغی اور ذہنی صلاحیت میں کم نہیں سمجھتی ہیں لیکن معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے روایتی دائرہ کار سے انہیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فطری طور پر مردوں اور عورتوں کے فرائض بٹے ہوئے ہیں۔ عورت کی دنیا اور اس کی دل چسپی اور فرائض کا مرکز اس کا گھر اور مرد کی دنیا اس کا آفس اور اس کا پیشہ ہے۔

ہم نے محسوس کیا کہ اکثر و بیش تر جاپانی عورتیں اپنی موجودہ طرز زندگی سے بالکل مطمئن ہیں اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کی آزادی کی تحریک سے بہت کم متاثر معلوم ہوتی ہیں ۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی تبدیلی بھی موجودہ سماجی ڈھانچے میں نہیں چاہتیں ۔ ہمارے خیال میں اس صورت حال کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ جاپانی مرد و عورت دونوں ہی دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے گذرنے کے بعد اب پرامن ماحول ، گھریلو اور خانگی تحفظ اور سکون چاہتے ہیں ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جاپان کی گھریلو زندگی میں شدید قسم کی دقیانوسی روایات پر عام طور سے عمل ہوتا ہے ۔ میاں بیوی کو آپس میں گھل مل کر رہنے اور بات چیت کرنے کا موقع شاذ و نادر ہی میسر ہوتا ہے ۔ وجہ ظاہر ہے کہ مرد باہر کی دنیا کے مشاغل کو گھریلو مشاغل پر ترجیح دیتے ہیں ۔ ان کے یہاں ایک قدیم کہاوت ہے کہ بہترین شوہر وہ ہیں جو جسمانی طور پر تن درست اور زیادہ وقت گھر سے باہر گذارے ، چنانچہ عام طور سے مرد گھر سے صبح سویرے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے نکلتے ہیں اور کام اور تفریح ختم کر کے رات گئے ہی ایک بار گھر لوٹتے ہیں ۔ ہفتہ کے چھ روز زیادہ تر لوگوں کا یہی پروگرام رہتا ہے ۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے مشاغل سے نہ تو کوئی غرض ہوتی ہے ، نہ دخل اندازی کرتے ہیں اور ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ہم لوگوں کے نقطہ نظر سے علیحدہ علیحدہ اپنی زندگی کی گاڑی کھینچتے ہیں ۔

ایک عورت نے کہا ،

"میں اور میرا شوہر دو مختلف جزیروں کے باسی ہیں ۔ اس کی دل چسپی کا مرکز اس کا آفس اور باہر کا کاروبار ہے اور میری دل چسپی کا مرکز میرا گھر اور میرے بچے ۔"

خوش گوار زندگی اور خوشی کے متعلق امریکن عورت اور جاپانی عورت کے فلسفہ حیات میں قطب شمالی اور قطب جنوبی کا بعد ہے بلکہ دونوں کا نقطہ نظر ایک دوسرے

سے قطعاً متضاد ہے ۔ امریکن عورت اگر یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ طرز زندگی سے مطمئن اور خوش نہیں ہے تو وہ اسے بدل لینے سے ہچکچاتی نہیں حتیٰ کہ وہ اپنا شوہر بھی اسی آسانی سے تبدیل کر لیتی ہے جس آسانی سے اپنے بالوں کا اسٹائل، لیکن جاپانی معاشرے میں رسم و رواج اور روایات کے خلاف جانے کا مطلب سارے اقدار کو ختم کر کے معاشرہ سے ناتا توڑ لینا ہے جس کے لئے جاپانی خواتین اپنے کو آمادہ نہیں کر پاتیں ۔ آسانی سے شوہر تبدیل کرنا تو دور کی بات رہی ۔ شاید بنیادی وجہ یہ ہے کہ جاپانی عورت میں برداشت، صبر و تحمل اور قربانی کا مادہ اب بھی بہت زیادہ ہے اور مغرب کی جنسی آزادی کے انقلاب نے اسے محبت، قربانی اور وفاداری کے جذبوں سے محروم نہیں کیا ہے ۔

وہاں روایتی انداز فکر و عمل کا مظاہرہ زندگی کے بہت سے اہم شعبوں کے علاوہ شادی بیاہ کے معاملہ میں بھی بہت ہوتا ہے ۔ عام طور سے شادیاں والدین کی پسند سے ہوتی ہیں اور وہی سارے معاملات طے کرتے ہیں ۔ جاپانی سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کی طے کی ہوئی شادی زیادہ پائدار اور زیادہ گھریلو تحفظ دے سکتی ہے ۔ رشتہ دکھانے والی عورتیں ہی ہوتی ہیں جو لڑکے لڑکی کی تصویریں اور دیگر معلومات دونوں فریقین کو مہیا کرتی ہیں ۔ اگر باقی کوالیفیکیشن بزرگوں کو پسند آتی ہیں تو اس کا انتظام کیا جاتا ہے کہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں ۔ اگر پہلی بار دیکھنے کے بعد لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کریں تو شادی سے پہلے مزید ملاقاتیں ہوتی ہیں تاکہ ایک دوسرے کے مزاج اور خیالات سے واقف ہو سکیں ۔ یہ بھی ایک رسم ہے اور اسے جاپان میں OMIAC کہا جاتا ہے ۔ اس طرح کی شادیوں کو LOVE MARRIAGE تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ زندگی کے متعلق، ہونے والے شوہر یا بیوی کا، کیا نقطہ نظر ہے، یہ معلوم کرنے کا موثر طریقہ ہے، گویا

معاشرتی اقدار کو برتتے ہوئے لڑکے لڑکی کو ایک دوسرے کو پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔

سماجی مطالبہ کے مطابق جب اس طرح چھان پھٹک کے بعد شادی ہو جائے تو اسے نباہنے کی حتی الامکان سعی کی جاتی ہے۔ ایک تو عورت میں قوت برداشت اور دوسرے سماجی دباؤ، نتیجہ یہ ہے کہ جاپان میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں طلاق کی شرح بہت کم ہے۔ وہاں ۲۰ فی صد سے زیادہ طلاقوں کا ریکارڈ اب تک قائم نہیں ہوا ہے۔ شادی کے بعد عورت اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کس قدر انہماک سے دل چسپی لیتی ہے، اس کی مثال مغربی ممالک تو خیر دور کی چیز ہے، اکثر مشرقی ترقی پذیر ممالک میں بھی نہیں ملتی۔ وہاں جونیئر اسکول سے لے کر کالج تک داخلہ مشکل سے ملتا ہے اور اگر کوئی بچہ داخلہ سے محروم رہ جائے تو یہ ماں کے لئے زندگی کی سب سے بڑی ناکامی ہوتی ہے۔

ان سب حقائق کے باوجود ہم نے محسوس کیا کہ اب روایتی شکنجہ کی گرفت کم از کم ذہنی رو کی حد تک کچھ کم ہو رہی ہے۔ اکثر نوجوان عورتیں اب اپنے شوہروں سے گھریلو تحفظ اور بچوں کے علاوہ کچھ اور بھی امید اور مطالبہ کرنے لگی ہیں۔ پچھلی نسل کو جو کچھ میسر تھا، اس پر قانع تھی۔ نئی نسل کی عورتیں شوہروں کی رفیق بننا چاہتی ہیں، مسائل زندگی کے حل کرنے میں ان کی ہم رکاب بننا چاہتی ہیں، چنانچہ عورتیں اب خاصی تعداد میں جاب مارکیٹ میں آنے لگی ہیں، لیکن جاپان کے لیبر لا کے مطابق عورتیں ایک خاص اوقات کار سے زیادہ گھروں سے باہر جاب مارکیٹ میں کام نہیں کر سکتیں کہ ان کی گھریلو زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔ دوسری نمایاں چیز جو عورتوں کے آفس میں کام کرنے کے سلسلہ میں ہے، وہ یہ کہ یونی ورسٹی کی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ آفس یونی فارم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں مرد باس کے احکامات ایک افسر کے پاس

سے دوسرے افسر تک پہنچانے اور انہیں چائے ناشتہ فراہم کرنے پر مامور ہیں ۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں ۔ ایک تو یہ عام روایت کہ نظم و نسق کا کام مردوں کا ہے اور ان کی دیکھ بھال اور کھلانے پلانے کا کام عورتوں کا ۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جاپان جیسے اعلیٰ صنعتی اور HI-TECH کے ملک میں سائنسی اور پیشہ ورانہ میدان میں عورتیں ابھی مردوں کے مقابلہ میں کارکردگی اور ایجاد کی اعلیٰ صلاحیت پیدا نہیں کر سکی ہیں ۔ بہرحال چونکہ نوجوان عورتیں اب دھیرے دھیرے (بغیر کسی نمایاں معاشرتی جدوجہد اور انقلاب کے) میدان عمل میں قدم رکھ رہی ہیں ، اس لئے امید ہے کہ ۲۱ ویں صدی تک وہ بھی نظم و نسق اور ایجاد و تحقیق میں مردوں کے ہم پلہ ہو جائیں گی ۔

جاپانی عورت کی اوسط عمر کی شرح دنیا کے سارے دوسرے ممالک کی عورتوں سے زیادہ ہے ، یعنی تقریباً اسی سال ۔ عموماً چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے جاپانی عورت کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں کی کل وقتی توجہ اور دیکھ بھال کے محتاج نہیں رہتے ۔ اس وقت اس کی زندگی کا گویا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے ۔ گھریلو مصروفیات کم ہو جاتی ہیں تو انہیں اپنی زندگی بے معنی نظر آنے لگتی ہے ۔ ایسی حالت میں روپیا کمانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی بے کار زندگی میں مقصدیت لانے کے لئے نوکری کرنا چاہتی ہیں ، لیکن اس بڑھتی ہوئی عمر میں انہیں جاب مارکیٹ میں سخت مقابلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر عورتیں تو کسی قسم کا بھی جاب حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہیں ۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر ادھیڑ عمر کی عورتیں مایوسی اور ذہنی بحران کا شکار ہو جاتی ہیں ۔ اس کے باوجود بھی لیبر فورس کی ادھیڑ عمر کی عورتوں کی تعداد خاصی ہے ، اس لئے کہ کمپنیاں انہیں بہت کم تنخواہ اور بہت چھوٹے اور غیر اہم کاموں کے لئے رکھتی ہیں یا وہ پارٹ ٹائم کام کرتی

ہیں ۔ عام طور سے کمپنیاں " ضرورت ہے " کے اشتہار میں خاص طور پر ۳۰ سال سے کم عمر کے امیدوار کو مانگتی ہیں ۔ ستر فی صد کمپنیاں یوں بھی ان کی عمر کے مد نظر ابتدا ہی میں ان کی درخواست رد کر دیتی ہیں ۔ اکثر ادھیڑ عمر کی عورتیں اگر خوش قسمتی سے برسرروزگار ہو بھی جائیں تو گھر والوں اور شوہروں سے چھپا کر کام کرتی ہیں، کیونکہ اب نوکری کرنا تو کوئی ہتک کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی، لیکن معمولی حیثیت کے کام اور کم تنخواہ پر نوکری کرنے سے ان کے شوہروں کا وقار مجروح ہوتا ہے ۔ اکثر اس طرح کی خواتین، جنہیں روزگار نہیں مل پاتا، سماجی سرگرمیوں میں سر گرم ہو جاتی ہیں کہ وقت تو کسی طرح کاٹنا ہے، چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ آج ادھیڑ عمر کی جاپانی عورت کے لئے وقت گذاری ایک تفریحی مشغلہ ہے جبکہ ان سے پہلے کی نسل کی عورت ان کی نانیاں، دادیاں، مائیں کھیتوں اور ماہی گیری کام کے ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرتی تھیں ۔ ویسے نوجوان تعلیم یافتہ لڑکیاں، جو روایت سے ذرا ہٹ کر گھر اور بچوں کے ساتھ کیریئر پر بھی نظر رکھتی ہیں، ان کے لئے ظاہر ہے یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ محض تفریح کے لئے یا وقت گذاری کے لئے کوئی مشغلہ اختیار کر لیتی ہیں ۔

## عراق، بغداد بھی جا پہنچے

بابل و نینوا کا دل پر بڑا سحر انگیز نقش تھا ۔ بغداد کے چوروں کے وطن بغداد کے دیدار کی تمنا الگ اپنی تڑپ رکھتی تھی ۔ سو ہمارے دل میں عراق کی تواریخی یا سیاسی کشش سے زیادہ افسانوی کشش تھی ۔ بچپن میں جو کچھ اس کے بارے میں سنا یا پڑھا تھا، اس نے دل میں اسے دیکھنے کا ایک ایسا جذبہ شوق بھڑکا رکھا تھا جس کے تسکین کی کوئی معقول اور عملی صورت نظر نہ آتی تھی ۔ بھلا بیٹھے بٹھائے اٹھ کھڑے

ہوں کہ ہم بے بی لون (بابل و نینوا) کی سیر کرنے یا بغداد کے چوروں کا مسکن دیکھنے عراق جا رہے ہیں کہ ہم نے جو کچھ پڑھا یا سنا ہے، اس کی توثیق اپنے ذاتی مشاہدہ سے کرنا چاہتے ہیں تو کچھ لوگ تو ہماری صحیح الدماغی پر شک کرنے اور اس سلسلہ میں قیاس آرائیاں کرنے میں جٹ جاتے اور کچھ (گو یہ دوسرے "کچھ" اپنی جگہ سو فی صد درست ہوتے) کہتے،

"محترمہ! آپ نے جو صدیوں پہلے کی روایات، قصے اور کہانیاں ان مقامات سے منسوب سنی ہیں، ان کے تو آپ کو آثار بھی اب مشکل سے ملیں گے۔" سو ہوا یوں کہ ۲۳ جون ۱۹۸۸ء کو جب ہم ایک بیرونی سفر سے کراچی واپس آئے تو معلوم ہوا کہ بغداد میں بین الاقوامی کانفرنس میں خواتین انجمن کی نمائندگی کرنے کے لئے شرکت کا دعوت نامہ آیا رکھا ہوا ہے۔ خوابوں کے چکنا چور ہونے کا چرچا تو بہت سنتے آئے تھے، مگر یہاں تو ڈھیروں خواب آنکھوں میں اتر آئے۔ الف لیلیٰ کی ہزار داستانوں کے مناظر نظروں کے سامنے ناچنے لگے ........ طلسم ہوش ربا!

"ارے ارے! کب جانا ہے؟ کہاں ہے دعوت نامہ؟ ........" معلوم ہوا کہ وہ کانفرنس تو مئی میں ہماری شرکت کے بغیر ہی ختم بھی ہو گئی۔

لیجئے! چاروں طبق، جو اب تک روشن نہ ہوئے تھے، روشن ہو گئے۔ ویسے خواب چکنا چور نہ ہوئے۔ وہ پلکوں پر سجے ہوئے تھے، دل کی دھڑکنوں میں لبے ہوئے تھے، تبھی تو اسی سال ستمبر میں بے بی لون فیسٹول میں شرکت کا دوسرا دعوت نامہ ملا اور دعوت نامہ بھی روانگی سے صرف چند روز پہلے۔ زیادہ دن پہلے ملتا تو اور تو کچھ نہیں، لیکن خوابوں کی عملی تعبیر کی دل فریبی سے کچھ عرصہ اور لطف اندوز ہو لیتے۔ خیر! جانے کا سب انتظام، ٹکٹ ویزا وغیرہ تو عراقی کونسلیٹ والوں نے کیا۔ وہ ہمارے پاسپورٹ پہلے ہی لے گئے تھے۔ ہمیں بس اپنا سوٹ کیس تیار کر کے ایر

پورٹ پر پہنچنا تھا۔

کراچی اور اسلام آباد سے مزید تین افراد جا رہے تھے۔ ہماری ان افراد سے کوئی جان پہچان نہ تھی اور ایرپورٹ چونکہ اپنے طور پر جانا تھا، اس لئے بغداد ایرپورٹ پہنچ کر ہی ان لوگوں سے رسمی سا تعارف ہوا۔ اسی جہاز سے انڈیا کا وفد بھی پہنچا۔ ایر پورٹ پر استقبالیہ کمیٹی کے افراد موجود تھے۔ کچھ لوگوں کو ہلٹن ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور کچھ کو دوسرے ہوٹل میں۔ ہم ہلٹن والوں کے گروپ میں پڑے انڈیا اور بنگلا دیشی وفد کے جھرمٹ میں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہلے سے اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ کس وفد کو کہاں ٹھہرایا جائے گا۔ ہم لوگوں کو کھانے ناشتے، چائے، مشروبات وغیرہ کے لئے کوپن کی ایک ضخیم کتاب حوالہ کر دی گئی، چنانچہ عیش یہ ہوا کہ صبح بستر پر پڑے پڑے فون کرتے کہ "چائے چاہیے" اور واقعی یہ پوچھے بغیر کہ "کون سی جناب!" الف لیلیٰ کے جن کی طرح چائے آموجود ہوتی اور ہمیں لگتا کہ ہم سچ مچ الف لیلیٰ کے دیش میں ہیں۔

ہم انجمن جمہوریت پسند خواتین کی صدر کی حیثیت سے مدعو تھے۔ پہنچنے کے گھنٹے بھر بعد ہی سے انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ افسوس! سارے انٹرویو عربی اخبار میں چھپے۔ پھر وہاں کی فیڈریشن آف ویمن نے ہمیں اپنا مہمان بنایا۔ ویمن فیڈریشن کی جانب سے ایک گاڑی، ڈرائیور اور ایک گائڈ لڑکی ہمیں مہیا کر دی گئی۔ سو بے بی لون کے جشن کے پروگرام میں شرکت کے علاوہ جتنا وقت ہمیں ملتا تھا، ہم خواتین انجمنوں اور گائڈ لڑکی کی رہنمائی میں اپنا پروگرام خود بناتے رہے۔ بغداد کے آس پاس کے تواریخی اور سیاحت کی اہمیت کے حامل (بشمول مقدس مقامات کی زیارت کے) وہ سارے مقامات دیکھے اور گھومے جہاں کار سے چند گھنٹوں میں پہنچ سکتے تھے۔

ایک روز پروگرام بنا کر گائڈ کے ساتھ کربلا گئے۔ شدید گرمی تھی اور برقع نہ

ہم پہنتے ہیں اور نہ ہماری گائڈ لڑکی، لیکن زیارت گاہ میں عبا کے بغیر نہیں جا سکتے تھے
گیٹ پر ہی عورتیں تھیں جن کا کام ہی کرایہ پر عبا مہیا کرنا تھا۔ میری گائڈ لڑکی ایک
میلا بوسیدہ سا عبایا ان عورتوں سے کرایہ پر لائی اس احساس کے باوجود کہ یہ خود
غرض ہو گی، ہم نے اپنی گائڈ سے فرمائش کی کہ وہ یہ بوسیدہ عبایا خود پہنے اور اپنا خاصا
اسٹائلش اور صاف ستھرا نیا عبایا ہمیں پہننے کے لئے دے دے۔ بے چاری نے بظاہر
بڑی خوش اخلاقی سے ہماری فرمائش پوری کی۔ جانے اس کے دل پر کیا گذری۔

زیارت گاہ سے باہر نکلتے ہی ہم عبایا اتار کر اپنے اصلی لباس، یعنی ساری اور
بلاوز میں آگئے۔ یہ گاؤں کی سی جگہ تھی۔ عورتیں جوق در جوق زیارت کے لئے جا
رہی تھیں۔ ہمارا اونچا انڈین اسٹائل کا بلاوز دیکھ کر سبھوں نے نظروں اور اشاروں
سے اور پھر چند نے باآواز بلند ہمیں عربی میں مخاطب کر کے غیر شرعی اور اسی نوع کے
دیگر الفاظ سے خوب خوب نوازا اور ہم چکنے گھڑے کی مانند گائڈ کے تحفظ میں چلتے رہے۔

ہمارے عراق پہنچنے کے پہلے ہی روز فیڈریشن آف عراقی ویمن کے وائس
پریذیڈنٹ کا فون آیا۔ سو دوسرے روز، یعنی ۲۶ ستمبر کو، ہم ۱۱ بجے دن ان سے ملنے
کے لئے فیڈریشن کے آفس لے جائے گئے۔

فیڈریشن کا آفس کیا تھا، ایک شاندار عمارت تھی۔ گیٹ سے اندر گاڑی
داخل ہوئی تو سینکڑوں کاریں اور بسیں قطار سے کھڑی تھیں۔ آفس تک پہنچتے پہنچتے
ایسا لگا جیسے کسی چھوٹی سی مملکت کے دارالخلافت میں آپہنچے ہوں۔

آفس میں پہنچے تو وائس پریذیڈنٹ صاحبہ دیگر عہدہ دار خواتین کے ساتھ
پذیرائی کو موجود تھیں۔ معلوم ہوا کہ صدر صاحبہ علیل ہیں اور اسپتال میں زیر علاج
انہوں نے بڑی دل چسپی سے پاکستان میں عورتوں کی تحریک کے بارے میں چھوٹے
چھوٹے سوالات کئے اور ہم نے فیڈریشن کی عمارت کی وسعت اور شان و شکوہ کو مدنظر

رکھتے ہوئے عراقی خواتین کی آزادی و حقوق کے بارے میں بڑے بڑے سوالات پوچھے۔ حال میں عرب خواتین کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک ریزولیوشن کی شدید مخالفت ہوئی تھی۔ یہ ریزولیوشن مردوں کے چار بیویاں بیک وقت رکھنے کے حق کی مذمت سے متعلق تھا۔ ہم نے ان سے سوال کیا،

آپ کی تنظیم کا رویہ اس ریزولیوشن کے سلسلہ میں کیا تھا؟

"مسز داؤدی! یہ حق تو مردوں کو اسلام نے دے رکھا ہے۔ اس کی مخالفت کیسے کی جا سکتی ہے۔" ہم پر ٹھنڈے پانی کے سینکڑوں گھڑے پڑ گئے، شرم سے نہیں مایوسی سے۔

خواتین کی انجمن ایک ہی حکومت کی سرپرستی میں چلنے والی جس کی جگہ جگہ شاخیں ہیں۔ بہت ساری شاخوں میں جا کر دیکھنے اور اپنی ترجمان لڑکی کے توسط سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ ویسے عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی پیشہ ورانہ تربیت پر دھیان دیا جا رہا ہے، یہ اندازہ تو بخوبی ہوا۔ مذہبیت اور مذہب کا احترام خاصا دیکھنے میں آیا۔ جب ہم خواتین انجمن کی سرکردہ رہنما یا وائس پریذیڈنٹ سے ملے تو امید تھی کہ عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں وہ ہماری ہم نوا ہوں گی، لیکن پتا نہیں پاکستان سے آئی ہوئی خاتون کے سامنے محض تدبر کو مدنظر رکھتے ہوئے یا سچے دل سے انہوں نے تعدد ازدواج کی حمایت میں وہی پرانی گھسی پٹی ملاؤں والی دلیل دے ڈالی جو جدید اجتہاد میں شاید کوئی جگہ نہ پا سکیں۔

فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس انہیں دنوں ختم ہوئی تھی اور کافی ڈیلیگیٹ ابھی موجود تھے۔ بہت کوشش کے باوجود ہمیں ویمن فیڈریشن کا "اغراض و مقاصد" کا مینیفیسٹو نہ مل سکا۔ نظریاتی طور پر اتنا نتیجہ ہم ضرور اخذ کر سکے کہ مغرب فیمنسٹ

تحریک اور عراق کی خواتین تحریک میں وہی بعد ہے جو روایتی طور پر مغرب و مشرق کے کلچر اور تہذیب و تمدن میں۔

ہم ۲۳ ستمبر علی الصباح بغداد پہنچے تھے۔ہوٹل آکر جیسے ہی تیار ہوئے تقریباً گیارہ بج گئے۔پہلے سے تیار شدہ پروگرام کے مطابق پہلے سمارا لے جایا گیا جو سیاحوں کی محبوب جگہ ہے اور شام کو بے بی لون کا جشن دیکھنے جانا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمیں سمارا جانے سے زیادہ قدیم شہر بابل کے دیدار کی تڑپ تھی۔پہلے روز تو شام کو پہنچے۔یہ جشن کئی روز پر مشتمل تھا۔مختلف ممالک سے آئے ہوئے وفود پروگرام کے مطابق اپنا ثقافتی اور کلچرل پروگرام پیش کرتے اور داد پاتے رہے۔انڈیا اور بنگلا دیش کا پروگرام بھی تفریحی اور فن کارانہ دونوں ہی تھا۔خیر! پاکستان میں تو گانا بجانا اور دیگر تفریحی پروگرام غیر اسلامی مانے جاتے ہیں، اس لئے یہاں کے وفد کو صرف دیکھنے اور تالیاں بجانے پر اکتفا کرنا پڑا۔

بے بی لون کے کھنڈرات میں خوب گھومے۔چپا چپا عظمت رفتہ اور ناپائداری زمانہ کی گواہی دیتا محسوس ہوتا تھا۔قدیم نوادرات پر مشتمل میوزیم بھی دیکھنے کی چیز ہے۔بے بی لون کے ہینگنگ برج کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔

تقریباً ۲۲۴۰ ق۔م۔میں بابل میوپوٹامیہ کا شہر ہوا کرتا تھا۔منگولوں نے اسے تیرھویں صدی عیسوی میں تاراج گیا۔اٹھارویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنا۔۱۹۱۲ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔پھر ایک زمانہ میں عراق کا دارالخلافہ رہا۔

بابل تو کئی بار گئے۔جشن بابل ہی میں تھا۔میوزیم میں طرح طرح کے نوادارت دیکھنے میں آئے، لیکن عبارتیں عربی میں لکھی ہوئی تھیں اور کوئی ڈھنگ کا

مترجم ساتھ نہ تھا۔ یہی حال شیر کے مجسموں کا تھا۔ ہر طرف ہر قابل ذکر عمارت پر شیر کا مجسمہ بنا ہوا آپ کو ملے گا اور بابل کے کھنڈرات میں تو طرح طرح کے شیر نظر آئے غنیمت یہ ہے کہ سب پتھر کے تھے۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ قدیم زمانہ میں کسی دیوزاد جادوگر نے کسی بات پر ناراض ہو کر شہر کی پوری آبادی کو پتھر کے شیروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہلٹن ہوٹل میں ہر صبح ہمیں ایک چھوٹا سا مٹی کی تختی پر شیر کا مجسمہ بنا ہوا ملتا تھا جیسے پھولوں کا گلدستہ عقیدت سے پیش کیا جائے۔ وہاں کے لوگوں سے شیر کی اہمیت پوچھی، لیکن یا تو زبان کی وجہ سے ہمارے میزبان حضرات ہمارے سوال کو واقعی نہ سمجھ سکے یا مصلحتاً کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔ ہمیں تو ایسا لگا کہ عراق کا قدیم تواریخی ورثہ اور ثقافتی میراث کی طرح شیر کا بھی ماں آدر ہوتا ہے۔

حمورابی کے مجسمے بھی اکثر و بیشتر دیکھنے میں آئے۔ بابل کے میوزیم کے باہر بھی بہت بڑا سا مجسمہ موجود ہے۔ خیر! شکر ہے حمورابی کے سلسلہ میں ہم اتنا جاہل عراق سے واپس نہ آئے جتنا شیروں کے سلسلہ میں۔ حمورابی کے قوانین، یعنی "کوڈ آف حمورابی" ہاتھ کیا آگئی ہماری درخواست پر ہمیں ملی۔ حکومت عراق کا شائع کردہ تو بغیر مانگے ہی ملنا چاہیئے تھا۔ دنیا کو باقاعدہ قانون دہندگان میں حمورابی کا نام شاید اولین اور سرفہرست مانا جاتا ہے۔

حمورابی بابل و نینوا کے شاہی خاندان کا چھٹا حکم راں تھا۔ اس کا زمانہ ۱۷۵۰ سے ۱۷۹۲ ق۔م۔ بتایا جاتا ہے۔ یہ پڑھ کر تعجب اور تاسف دونوں ہی ہوتا ہے کہ جب کرہ ارض پر بسنے والے انسان آج کے مقابلہ میں تہذیبی اور تمدنی، علمی اور سائنسی لحاظ سے عہد طفلی میں تھے اور جمہوریت اور حقوق انسانی کے بارے میں بہت کم شعور رکھتے تھے، اس دور میں حمورابی نے مختلف مذہبی عقائد میں ہم آہنگی اور رواداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مذہبی تنگ نظری سے قطع نظر اصلاحات کیں۔

نتیجتاً ایک ایسے مذہب کا آغاز اور فروغ ہوا جسے قومی مذہب کہا جا سکتا ہے ۔ اس قومی مذہب کا مقدس مرکز بے بی لون میں مردک کی عبادت گاہ تھی ۔ حمورابی کے قوانین اپنے زمانہ اور معاشرتی حالات کے نقطہ نظر سے خاصے جامع ہیں اور زمانہ قدیم کے قوانین میں اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ فوج داری ، سول ، تجارتی ، زراعتی ، معاشرتی اور خاندانی امور سے لے کر اس زمانہ کے کسی بھی معاشرتی پہلو کو حمورابی نے اپنی قانون سازی میں نظر انداز نہیں کیا ہے ۔ قوانین سازی کی تواریخ میں " کوڈ آف حمورابی " کو تحریری قوانین کا سنگ بنیاد کہنا مبالغہ نہ ہو گا اور عراق اپنے اس قیمتی ورثہ پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ۔ حمورابی نے اپنے کوڈ کو پتھر کی سل پر کندہ کرایا ۔ یہ پتھر کی سلیں میوزیم میں نمائش کے لئے موجود ہیں ۔ حمورابی کے کوڈ پر تو اس کے عہد میں بھی مکمل طور پر عمل نہ ہو سکا ۔

بابل و نینوا کئی بار گئے یا وفود کی دیکھ بھال کرنے والی کمیٹی کی طرف سے لے جائے گئے ۔ جشن نہیں تھا ، میلہ تھا ، نمائش تھی ۔ ایک اسٹال تھا پلاسٹک کے پھولوں کا ۔ ویسے عام طور سے تو جس اسٹال میں گئے " زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم ۔ " بس ٹکر ٹکر تاک کر یا اشاروں سے سمجھ میں آنے والی گفتگو کر کے نکل آتے تھے ۔ ہم بڑے خوش ہوئے کہ اس اسٹال پر جو لڑکی تھی ، اسے اپنا مفہوم ادا کرنے تک انگلش آتی تھی ۔ اس لڑکی کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور ساتھ میں اس کی ماں ۔ لڑکی بڑی خوب صورت اور ملنسار تھی ۔ اس سے گفتگو کرنے میں ہم اتنا منہمک ہوئے کہ روانگی کا وقت بھی بھول بیٹھے ۔ جب ساری بسیں روانہ ہو گئیں اور صرف ایک باقی رہ گئی تو ہمارے صرف عربی جاننے والے انچارج صاحب ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس اسٹال میں پہنچے ۔ وہ سرزنش تو کیا کرتے ، ہم خود ہی بہت شرمندہ ہوئے ۔ بہر حال ان کے پیچھے پیچھے بس تک دوڑنے سے پہلے ہم نے یہ معلوم کر ہی لیا

کہ اس لڑکی کا شوہر ایران عراق کی جنگ میں مارا گیا ۔ حکومت کی طرف سے اسے رہنے کو گھر، بچوں کی پرورش کے لئے وظیفہ، کار اور دوسری بہت سی سہولتیں ملی ہوئی تھیں ۔ اس لڑکی نے اپنے اسٹال سے ایک حسین پلاسٹک کے پھولوں کا گلدستہ بھی تحفتہ دیا جو واپس آتے ہوئے ایرپورٹ پر چیکنگ کرتی ہوئی عراقی خاتون کی نااہلی کا شکار ہو گیا ۔ ہوا یہ کہ ان خاتون نے ہمارے سوٹ کیس پر بیگ نمبر کا ٹکٹ نہیں لگایا ۔ ہم ہاں ہاں کرتے ہی رہے اور سامان بغیر کسی نشان کے جہاز میں سوار ۔ بھلا کراچی آکر کاہے کو ملتا؟

عراق کے لئے روانہ ہوئے تو اس خیال میں تھے کہ ایک ایسے ملک میں جا رہے ہیں جو پچھلے سات سالوں سے جنگ کی آماج گاہ بنا ہوا تھا کہ انہیں دنوں جنگ بندی کا اعلان ہوا تھا ، لیکن ایرپورٹ سے ہلٹن پہنچنے تک اور پھر دوران قیام مختلف مقامات پر گھومنے کے باوجود مجھے کوئی بھی ظاہری آثار جنگ کی تباہ کاریوں کے نہ ملے خیر! ظاہری آثار تو اس لئے نہ ملے کہ بغداد نہ تو محاذ جنگ تھا نہ اس پر بمباری ہوئی تھی ۔ لوگوں کا جوش و جذبہ بہت بلند تھا ۔ ہر ایک خوش تھا کہ عراق نے جنگ جیت لی ، لیکن اتنے لوگوں سے ملے ، کوئی گھرانا ایسا نہ پایا جہاں سے کوئی بیٹا ، بھائی ، باپ یا شوہر محاذ جنگ پر مارا ، زخمی یا جنگی قیدی نہ ہوا ہو ۔

ہم لوگوں کی مجلس انتظامیہ کی نگراں ایک لڑکی تھی ۔ وہ خوب میک اپ کر کے ، اچھے اچھے کپڑے پہن کر اور زیور سے آراستہ ہو کر آتی تھی ۔ گول مٹول ، موٹی موٹی آنکھوں والی جس کی مصنوعی پلکیں ہمیشہ بوجھل رہتی تھیں ۔ اس کا نام دیانت تھا اور دیانت چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو پڑتی تھی اور گھبرا جاتی تھی ۔ دیانت کا منگیتر ایران میں جنگی قیدی تھا اور دیانت امید و بیم کے درمیان ہچکولے کھا رہی تھی کبھی تو وہ اس خدشہ سے سہم جاتی کہ اگر اس کا منگیتر واپس نہ آیا تو؟ اور کبھی حسین

اور دھنک رنگ خوابوں میں کھو جاتی کہ وہ جلد ہی دشمن کی قید سے رہا ہو کر آجائے گا اور پھر اس کی شادی ہو گی ۔ دیانت نے اپنا شادی کا کارڈ بھیجنے کے لئے میرا پتا بھی لیا تھا، لیکن دیانت کی شادی کا دعوت نامہ مجھے اب تک نہیں ملا ۔ پتا نہیں اس کا منگیتر دشمن کی قید سے رہا ہو کر آیا کہ نہیں ۔ شاید اس کی شادی ہو گئی ہو ۔ شاید اس کا ننھا سا گول مٹول بچہ بھی ہو یا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آزاد ہو کر آتے ہی دیانت کے منگیتر کو کویت پر حملہ کرنے کے لئے پھر محاذ پر بھیج دیا گیا ہو لیکن دیانت تو بڑی معصوم سی ، ارمانوں بھرا دل رکھنے والی لڑکی تھی ۔ اس کے ساتھ قسمت اتنی سفاک بھی ہو سکتی ہے! لیکن معصوم اور ارمانوں بھرے دل والے تو وہ سبھی نوجوان لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں جو جنگ کی بھٹی میں جھونکے جاتے ہیں ۔ دیانت کوئی انوکھی لڑکی تو نہ تھی، پھر اس کے ساتھ قسمت نے انصاف کیوں کیا ہو گا!

# لیبیا کی یاترا

۱۹۹۲ء کے دسمبر میں لیبیا سے خواتین کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ مع اخراجات آمد و رفت کے وعدہ کے ملا۔ اس دعوت نامہ کی نوید اور انتظار گذشتہ ایک سال سے تھا۔ سو جب امید نے حقیقت کا روپ دھارا اور یہ سیاحت بس کی بات لگی تو صحت کی خرابی کے باوجود جذبات نے جانے کے حق میں فیصلہ کر ڈالا۔ نیا ملک، نئے لوگ، نیا اور انوکھا سیاسی نظام۔ سربراہ حکومت وہ جسے استعماری عناصر نیم پاگل سمجھیں کہ کھلم کھلا امریکا جیسی واحد سپر پاور سے ٹکر لینے پر تلا ہوا جس نے فضائی پابندیوں کی بھی پروا نہ کی، اسی سربراہ کے زیر سایہ عورتوں کی بین الاقوامی کانفرنسیں! بھلا کس کافر دل کے بس کی بات تھی جو یہ موقع ہاتھ سے گنوا دیتا۔ ویسے بھی خواہوں نے بہکانے کی اپنی سی ساری کوششیں کر ڈالیں۔ ہوائی ناکا بندی سے دھمکایا، سمندری سفر کی صعوبتوں کا خوف ذہن نشین کرنے کی سعی کی اور پھر میری اپنی کم زور صحت کی دہائی دی جسے ایک مہینے پہلے ہی دل کا ہلکا سا دورہ پڑا تھا اور جسے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ مگر توبہ کیجئے صاحب! وہ آتش شوق ہی کیا جسے دور اندیشی کے چھینٹے شعلوں کی مانند بھڑکانے کا کام نہ کریں۔

وقت کم تھا۔ ترپولی میں کانفرنس کا افتتاح ۱۹ دسمبر کو ہونے والا تھا۔ میرے علاوہ دو اور لڑکیاں بھی کراچی سے کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہی تھیں۔ ایک تو غالباً ابھی ابھی تعلیمی زندگی سے بدالے کر میکے سے پیا دیس سدھارنے کے انتظار میں بیٹھی تھی اور خاصی تیز ذہن اور مسائل سے آگاہ معلوم ہوتی تھی اور مجھے تو امید ہے کہ ظاہری طور پر ہی نہیں بلکہ واقعی وہ انہی خصوصیات کی حامل ہے۔ دوسری لڑکی کی ایک سال پہلے شادی ہوئی تھی اور گود میں تین ماہ کی بچی تھی۔ یہ عرصہ تک اپنے والدین کے ساتھ لیبیا میں رہی تھی اور وہیں سے بیاہ کر کراچی آئی تھی۔ نشاط واقعی

اپنے نام کی مکمل تفسیر اور غیروں کو بھی خوشیاں اور سکون و فرحت بخشنے والی لڑکی تھی ۔ ان دونوں لڑکیوں سے میری پہلی ملاقات لیبیا جانے کے چکر میں ہوئی ۔ لیبیا سے واپسی پر میں نہ صرف وہاں کے بارے میں بہت سے نئے انکشافات اور تجربات کا پلندا لے کر آئی بلکہ اسی سلسلہ میں یہ امید افزا تجربہ بھی حاصل ہوا کہ نئی نسل میں سبھوں نے انسانیت اور اچھی تہذیب و اقدار اور روایات کو تیاگ نہیں دیا ہے ۔

۱۳ دسمبر کی صبح اسلام آباد سے لیبیا کا ویزا لے کر اسی روز شام کو کراچی واپس آئی ۔ روم اور مالٹا دو اہم مقامات پڑاؤ کے تھے ۔ وقت کی کمی کے باعث ویزا نہ لے سکی حالانکہ یہ تاکید منتظمان کانفرنس نے خاص طور پر کی تھی کہ ان دونوں جگہوں کے ویزے لے کر جاؤں ، لیکن یہاں کا ویزا لینے میں ہفتہ بھر کی مزید تاخیر ہوتی ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ روم میں کوشش کی جائے گی اور اگر ویزا نہ ملا تو پھر پاس میں واپسی کا ٹکٹ ہے ہی ۔ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر لوٹ آؤں گی ۔ ویسے یقین کامل تھا کہ میں اتنی بڑی مہم پر جا رہی ہوں ، یقیناً ایرپورٹ پر ویزا مل جائے گا ، سو وہی ہوا ۔ روم سے مالٹا اور مالٹا سے سمندری جہاز کے ذریعہ ترپولی پہنچے ۔ یہ بحری سفر تقریباً چودہ گھنٹوں کا رہا اور سب تو ٹھیک ہی تھا ہمیں رات گذارنے کے لئے دو بستر کا کیبن بھی ملا ، لیکن ٹوائلٹ روم بڑے گندے تھے جس کی وجہ سے سمندری سفر اذیت ناک گذرا ، کہنا مبالغہ نہ ہو گا ۔

۱۹۴۹ء میں لیبیا بظاہر نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہوا اور ادرس سانوسی کی بادشاہت قائم ہوئی ۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کی ایک سہانی صبح معمر قذافی کی زیر قیادت اس بادشاہت کا زوال بلکہ مکمل خاتمہ ہوا اور عظیم " الفتح " انقلاب کا سورج طلوع ہوا ۔ انقلاب کے قائدین کا دعویٰ ہے کہ لیبیا کا یہ انقلاب عام فوجی انقلاب سے یکسر مختلف ہے کہ اس انقلاب کا مقصد اقتدار ، عوام کو منتقل کرنا تھا ۔ معمر قذافی کی شہرہ آفاق " سبز کتاب "

کو اس انقلاب کی فلسفیانہ اور نظریاتی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۷ء کے مارچ میں لیبیا کے عوام کی جانب سے ایک اعلان نامہ جاری ہوا موسوم بہ "عوامی اقتدار کا اعلانیہ جس کے مطابق لیبیا" عوامی سوشلسٹ لیبیا عرب جماہریہ" قرار پایا۔

جماہریہ اور "سبز کتاب" کے سیاسی نظریہ کے مطابق نمائندہ جمہوریت عوام کے استحصال اور انہیں حقیقی اقتدار سے محروم رکھنے کا کامیاب ہتھکنڈا ہے۔ عوامی اقتدار صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ عوام براہ راست ملکی امور میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے لیبیا میں عوامی کانگریس اور عوامی کمیٹیوں کا طریقہ کار وضع کیا گیا ہے۔ انقلاب کے قائدین اور رہنما یہ باور کرتے اور یقین دلاتے ہیں کہ اس طرح کی کمیٹیوں اور کیمون کے ذریعہ عوام متفقہ طور پر ملکی امور کے معاملات کا بغیر کسی نام نہاد نمائندہ جماعت کی دخل اندازی کے مثبت فیصلہ کر سکیں گے۔

براہ راست عوامی جمہوریت کو اب تک سارے متعارف شدہ سیاسی نظاموں میں مکمل ترین کہا جائے تو غلط نہ ہو گا، لیکن اس کا عملی اطلاق مشکل ہی نظر آتا ہے۔ موجودہ دور میں جبکہ انسانی آبادی، انسانی مسائل، سائنس اور ایجاد و اختراع ساری حدود کو پھلانگ گئی ہیں، یہ امید ذرا رومانٹک ہی نظر آتی ہے کہ کانگریس اور کیمون کے طریقہ کار سے عوام عالمی مسائل، عالمی تشدد اور پس ماندہ اقوام کی معاشی مشکلات کو حسب دل خواہ بغیر سیاسی جماعتوں کی رہنمائی کے حل کر سکیں گے۔ سوویت یونین میں ساری سیاسی جماعتوں اور اختلاف رائے کو دبا کر صرف ایک تنظیم کو عوامی آواز، عوامی فیصلہ اور عوامی اقتدار کا نمائندہ تسلیم کیا گیا۔ نتیجہ آج سامنے ہے سوشلسٹ جماہریہ کی "سبز کتاب" کے نظریہ کے مطابق اقتدار، ہتھیار اور دولت یہ تینوں چیزیں استحصال کو جنم دینے والی اشیاء کا سرچشمہ ہیں۔

"سبز کتاب" میں عورتوں کی آزادی اور سماجی حیثیت پر بھی ایک باب ہے۔ صدر قذافی کے نظریہ کے مطابق عورتوں کا صحیح مقام اندرون خانہ، گھرداری اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا ہے کہ قدرت نے عورت اور مرد کو فطری طور پر مختلف فرائض کی ادائگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ عورتوں کی آزادی اور حقوق کے حوالہ سے لیبیا میں عورتوں کو حصول معاش کی ضرورت ہے اور نہ ہمت افزائی کی۔ مردوں کو بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے، اس لئے کہ اسلام لیبیا کا مذہب ہے اور مذہب چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے۔ ویسے میں نے دیکھا کہ لیبیا میں لڑکیاں خاصی تعداد میں نہ صرف اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں بلکہ باقاعدہ ملٹری اکیڈمی میں ان کی فوجی تربیت ہوتی ہے جس میں انہیں ہر طرح کے آلات حرب سے روشناسی اور ان کے استعمال کی تربیت دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کی اس ملٹری اکیڈمی کا معائنہ کر کے جب میں ہوٹل واپس آئی تو پھر "سبز کتاب" میں عورتوں کے باب کو ذرا زیادہ گہرائی سے پڑھنے کے لئے کھولا۔

میں لیبیا میں عورتوں کی بین الاقوامی کانگریس کی طرف سے مدعو کی گئی تھی ظاہر ہے یہ سمجھ رہی تھی کہ بین الاقوامی سطح پر خواتین کے مخصوص مسائل زیر غور اور زیر بحث آئیں گے، چنانچہ پاکستان میں تحریک نسواں کے حوالہ سے مختلف سطح پر اور مختلف افراد و انجمنوں کے ذریعہ جو کچھ شعور و آگہی سماجی، سیاسی اور قانونی حقوق و مرتبہ کے سلسلہ میں جدوجہد اور کامیابی ہو رہی ہے، اس کی رپورٹ باقاعدہ صدر "انجمن جمہوریت پسند خواتین" کی حیثیت سے لے کر گئی تھی، لیکن وہاں پہنچ کر کانگریس کی افتتاحی تقریب ہی میں یہ اندازہ ہو گیا کہ جو کچھ بھی سمجھا تھا، وہ محض میری غلط فہمی تھی۔ یہ کانگریس عورتوں کی ضرور تھی، لیکن عورتوں کے مسائل پر غور کرنے کے لئے نہیں بلکہ صدر قذافی کے "تیسرے بین الاقوامی نظریہ" کی

عورتوں کے ذریعہ تنظیم و اشاعت کے لئے منعقد کی گئی تھی۔

" تیسرا بین الاقوامی نظریہ " کے فلسفہ اور مغربی طرز کے فیمنزم میں براہ راست نظریاتی تصادم پایا جاتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات اس لئے بھی نہیں ہے کہ آج امریکا اور لیبیا دونوں ہی ایک دوسرے کو بین الاقوامی دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے سیاسی، معاشی اور سماجی ہر نظریہ زندگی میں دونوں براہ راست متصادم ہیں امریکی معاشرے میں فرد کی آزادی کے حوالہ سے عورت اپنے آپ کو ہر روایتی، اخلاقی اور سماجی بندھن سے آزاد کرنے کی جدوجہد میں جٹی ہوئی ہے۔ وہ جنس کی بنیاد پر " مرد کی برتری کا معاشرہ " ختم کر کے صنفی بنیاد پر غیر استحصالی نظام کے مطالبوں کے مطابق معاشرہ کو ڈھالنے کی بجائے " عورت کی برتری کا معاشرہ " قائم کرنے کی دھن میں گرفتار ہے۔

امریکا میں خاندان اور شادی کو فضول سا سمجھا جانے لگا ہے۔ " واحد والدین " ادارہ، جہاں عورتیں شادی کے بندھن سے آزاد بچے کی ماں اور، اس کی واحد سرپرست بن کر حکومت کی اعانت سے اس کی پرورش کرتی ہیں، خاصا عام ہو رہا ہے کہتے ہیں ان مغربی اور امریکی ممالک میں ۲۱ ویں صدی میں ماں، باپ اور بچوں پر مشتمل خاندانوں کا مستقبل خاصا تاریک ہے۔ ظاہر ہے جہاں روایتی خاندان اور تقسیم کار کے سلسلہ میں عام روز افزوں رجحان یہ ہو، وہاں صدر قذافی کا بنیادی سماجی فلسفہ کہ خاندان سے بڑھ کر انسان کے لئے دوسرا کوئی سماجی ادارہ اہم اور بنیادی نہیں ہے، کیونکہ خاندان ایسی سماجی اکائی ہے جو انسانی فطرت سے عین مطابقت رکھتی ہے، ناقابل قبول ہے۔ جیسا کہ ابھی میں نے کہیں ذکر کیا ہے کہ صدر قذافی کے نظریہ کے مطابق بحیثیت انسان، عورت و مرد کے حقوق اور حیثیت مساوی ہیں، لیکن وہ موجودہ فیمنزم کے برخلاف دونوں صنفوں کے فرائض کو یکساں تسلیم نہیں

کرتے کہ دونوں کے صنفی اور بائیولوجیکل فرائض کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا ۔ شروع میں تو میں گھبرائی اور سمجھی کہ صدر قذافی عورتوں کو صدر ضیا الحق کی مانند چادر اور چار دیواری ہی میں محبوس رکھنا چاہتے ہیں، لیکن الیکٹرانک فیکٹری، لڑکیوں کی ملٹری اکیڈمی وغیرہ دیکھ میں نے یہ تو فیصلہ کر لیا کہ یقیناً "سبز کتاب" کا فلسفہ چادر اور چار دیواری کی موجودہ لیبیائی بندشوں اور بندھنوں کو پھلانگ کر (کہ لیبیا کی عورتیں قبائلی معاشرہ کی فرد ہونے کی بنا پر کچھ زیادہ ہی پس ماندگی کا شکار ہیں) ان کو کھلی دنیا میں مردوں کے مدمقابل لانے کی جدوجہد کا فلسفہ ہے ۔ اپنی صنف سے شرمانا اور قانون فطرت سے ٹکرا کر مردوں کی نقالی کرنا نہ تو عورت کو استحصال سے نجات دلا سکتا ہے نہ حقوق، عظمت اور وقار عطا کر سکتا ہے ۔

ایک روز مجھے الیکٹرانک فیکٹری میں لے جایا گیا ۔ "سبز کتاب" کی ایک تعلیم یہ ہے کہ عورت کا مقدم کام یہ ہے کہ وہ گھر میں بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرے، لیکن الیکٹرانک فیکٹری میں مجھے اسمبلنگ کے کام میں لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آئیں ۔ انچارج افراد یقیناً مرد تھے اور یہ ویسے کوئی تعجب یا عورتوں کے خلاف تعصب کی بات نہیں ہے ۔ صدر قذافی کے دور سے پہلے کے لیبیا میں عورتوں میں نہ تعلیم تھی نہ شعور ۔ یہی کیا کم خوش آئند حقیقت ہے کہ اتنے کم عرصہ میں قذافی عورتوں کو فوجی اور فنی مہارت کے میدان میں تعلیم و تربیت کے لئے لے آئے ۔

ہم لوگوں کو جمہاریہ کے بہترین پرفضا مقام پر ساحل سمندر کے بالکل سامنے وہاں کے اعلیٰ ترین ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا ۔ ویمن کانگریس کی ناظم اعلیٰ فاطمہ امر کے سوا کسی دوسری مقامی خاتون کے ملک میں وجود تک کے آثار نظر نہ آئے ۔ چند مرد حضرات تھے جو بااختیار اور اعلیٰ عہدوں سے منسلک معلوم ہوتے تھے اور ہر وقت ہوٹل میں موجود پائے جاتے تھے اور مختلف زبانیں بول اور سمجھ سکتے تھے ۔ ان کے

علاوہ استقبالیہ کمیٹی کی ارکان اور لڑکیاں تھیں جو سبھی مختلف مقامات مثلاً انڈیا، پاکستان، بنگلا دیش، فلپائن وغیرہ سے نوکری کے سلسلہ میں آئے ہوئے لوگوں کی اہل خاندان تھیں۔ ہمیں ہوٹل سے باہر اپنے طور پر کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ کچھ ڈیلیگیٹ خواتین کو اس پر سخت برہمی تھی، لیکن میرے خیال میں یہ پابندی لیبیا کے اپنے حالات کے پیش نظر قابل اعتراض حد تک سخت بھی نہ تھی۔ باہر سے آئی ہوئی ڈیلیگیٹ خواتین میں اکثر ایسی تھیں جو یا تو اپنے شوہروں کی نوکریوں کے سلسلہ میں وہاں پہلے رہ چکی تھیں اور کچھ ایسی بھی تھیں جو خود وہاں سروس کر رہی تھیں۔ جن ڈیلیگیٹ خواتین کے ملاقاتی شناسا یا عزیز وغیرہ لیبیا میں تھے، وہ باقاعدہ اجازت حاصل کر کے انہیں اپنے ساتھ معینہ عرصہ کے لئے لے جا سکتے تھے۔ میرا چونکہ کوئی دوست آشنا لیبیا میں نہ تھا، اس لئے میں شروع میں صرف وہیں جا سکی جہاں ہمارے میزبان سبھوں کو لے کر گئے، لیکن جلد ہی استقبالیہ کمیٹی کے کچھ ارکان سے خاصی دوستی ہو گئی اور ان کے طفیل میرا لیبیا کا دورہ مکمل ہو سکا۔ مکمل اس معنی میں کہ وہاں کی مقامی قبائلی خواتین سے ملنے اور ان کا رہن سہن دیکھنے کا موقع ملا۔ سو یہ خواہش بھی نئے دوستوں کے طفیل پوری ہوئی، ورنہ میں ایک خلش دل میں لئے ہوئے واپس آتی۔ براہ راست تو لیبیائی خاتون سے بات نہ کر سکی کہ

"زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم"

بہرحال جس لڑکی کے ساتھ میں جاتی تھی، اس نے مترجم کے فرائض انجام دیئے۔

صدر قذافی کے اقتدار میں آنے سے پہلے وہاں کے عام لوگ خیموں میں رہتے تھے۔ اب خیمے آثار قدیمہ کے طور پر اٹھا کر میوزیم میں رکھ دیئے گئے ہیں اور باہر سے آنے والوں کو "پہلے اور اب" کا فرق واضح کرنے کے لئے دکھائے جاتے ہیں۔ بہرحال

یہ حقیقت ہے کہ میں جتنی مقامی عورتوں سے ملی ، سب اپنے صدر سے مطمئن معلوم ہوتی تھیں ۔ ان کا کہنا تھا کہ قذافی نے انہیں پکا گھر اور زندگی کی ساری آسائشیں دیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں ۔

سارے مسائل کا حل " اشتراکیت " ہے ۔ مارکس کے حوالہ سے جب اشتراکیت کا فلسفہ پڑھا تھا اور اس پر ایمان لائی تھی تو اشتراکیت کے ہر نظریہ اور اقدام کو " تواریخی ضرورت " یا تواریخی عمل کے ناگزیر ہونے کی بنا پر ایک خاص من پسند نتیجہ کے وجود میں آنے پر یقین رکھتی تھی ۔ صدر قذافی کی " سبز کتاب " کی رو سے اشتراکی معیشت کے بغیر دنیا سے جنگ و جدل ، ناانصافی اور استحصال کا خاتمہ ممکن نہیں ، لیکن قذافی کی اشتراکیت روس اور دوسرے موجود اشتراکی نظاموں سے بالکل مختلف ہے ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ لیبیا کے علاوہ دیگر اشتراکی ممالک میں خود ریاست عوام کا استحصال کرتی ہے اور عوام ، اقتدار ، فوجی طاقت اور دولت سے یکسر محروم رکھے جاتے ہیں ۔

تیسرے عالم گیر نظریہ کی رو سے مانگ ، رسد اور منافع کی کوئی اہمیت نہیں ہے ۔ اہمیت صرف پیداوار اور اس کی جائز تقسیم کی ہے ۔ ہماری لیبیا میں سالم بن عامر سے جو بڑے اسکالر ، لیبیا کے حکومتی کل پرزہ میں اہم شخصیت اور سیمینار کے (جو ہم لوگ ہر روز ۱۰ بجے سے ۵ بجے تک اٹینڈ کرتے تھے) واحد مقرر تھے ، اکثر سیمینار کے دوران علاوہ دوسرے امور کے ، اس چیز پر بحث ہوتی تھی کہ ابھی تو لیبیا نے سفر شروع کیا ہے ، گویا ابتدائے عشق ہے لیکن قوموں کی برادری میں کوئی ملک نفع نقصان ، رسد اور مانگ پر غور کئے بغیر خود کو ابتدائی معاشی اور پیداواری سرگرمیوں میں آگے کیونکر لے جا سکتا ہے ۔ عوام کی بنیادی اور سادہ ضروریات تو آغاز تمدن سے بھی پہلے پوری ہوا کرتی تھیں ، لیکن آج کے انتہائی پیچیدہ طریقہ پیداوار و تقسیم کے دور

میں عالمی برادری کے ساتھ دوڑ لگانے کے لئے تو شاید یہ انداز عمل موثر نہ ہو۔

ہم لیبیا صرف پندرہ دنوں کے لئے گئے تھے، لیکن ہمیں ایک مہینے ٹھہرنا پڑا۔ ستم یہ کہ ہمارے ترپپولی پہنچنے کے چند ہی روز کے بعد ترپپولی آئے ہوئے جہاز کا حادثہ ہوا۔ بہت سارے لوگ ہلاک ہوئے۔ حادثہ کے اسباب تو مجھے معلوم نہ ہو سکے، ویسے سرکاری سطح پر کہا گیا کہ امریکا کی عائد کردہ ہوائی ناکا بندی کے سبب چونکہ باہر سے مرمت کا سامان نہیں آسکتا، اس لئے یہ حادثہ ہوا۔ ویسے جتنے منہ اتنی باتیں۔ اب مجھ جیسا باہر سے آیا ہوا نمائندہ اپنے گھر خبر بھی نہ کر سکتا تھا کہ میں خیریت سے ہوں۔ رات رات بھر ہم لوگ ٹیلی فون کرنے کی سعی میں لگے رہے تھے لیکن بے سود ادھر کانگریس ختم ہو گئی، لیکن ہماری واپسی کی نہ تو کسی تاریخ کا پتا چلا اور نہ تاخیر کا سبب معلوم ہوا۔ بس ہمیں یہی بتایا جاتا تھا کہ سمندری طوفان آیا ہوا ہے، اس لئے جہاز (پانی کے) رکے پڑے ہیں۔ بارے خدا خدا کر کے ۱۴ جنوری کو خبر ملی کہ کل صبح ہم لوگ روانہ ہو رہے ہیں اور واقعی روانہ ہو کر گھر بخیر و عافیت پہنچ بھی گئے۔

## ساؤتھ افریقہ کا تاریخی انتخاب

نیلسن منڈیلا کا نام ۲۰ ویں صدی کی منفرد اور اہم تواریخ ساز شخصیتوں کی حیثیت سے انسانیت کے لئے ہمیشہ ہمیشہ باعث فخر رہے گا۔ مادی شکل میں غلامی کی لوہے کی بیڑیوں کو کاٹنے میں جو فیصلہ کن کردار ابراہیم لنکن کا رہا ہے، وہ بڑے بڑے مصلحین، علم برداران مساوات اور رنگ و نسل کے تعصب کے خلاف جہاد کنندگان سینکڑوں برسوں میں ادا نہ کر سکے تھے۔ انہوں نے غلامی کے خلاف آواز کسی خاص عقیدہ یا مسلک کے حامیوں کے لئے نہیں بلکہ ہر اس انسان کے حق میں اٹھائی جس کے پیروں میں اسی جیسے انسانوں نے بیڑیاں پہنا کر حقیقتاً ان سے

جانوروں کا سا سلوک روا رکھا۔ اس معنی میں اسے انسانیت کا عظیم ترین محسن اور ۲۰ ویں صدی کا تواریخ ساز مجاہد کہا جا سکتا ہے ایسی تواریخ عالم جو اب تک اپنی نوعیت کی واحد رہی تھی اور اس واحد نوعیت کی نظیر، اس کی دوسری کڑی منڈیلا کی قربانیوں اور جدوجہد کی مرہون منت ہے۔ منڈیلا نے جنوبی افریقہ میں سیاہ فام قوموں کی دوسری زنجیر، جسے ہم لوہے کی بجائے ذہنی، قانونی، سماجی و معاشرتی زنجیر (APARTHEID) کہتے ہیں، توڑ پھینکی۔ افریقہ کی آخری نوآبادتی سفید فام قوم نے آخر ہتھیار ڈال کر ۳۰۰ سال کے استحصال اور ظلم و ستم کے بعد آزادی کے متوالوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

افریقن نیشنل کانگریس ۱۹۱۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ نسلی علیحدگی (APARTHEID) کی پالیسی کے بانی سابق صدر F. W. DE CLARK کی قومی پارٹی سے نیشنل کانگریس پہلے قائم ہوئی تھی۔ اس دوران اے۔ این۔ سی۔ نے جدوجہد، تشدد اور قید و بند کی بے مثال اور بے حساب صعوبتیں جھیلیں۔ خود منڈیلا ۲۷ سال جیل میں سزا بھگتنے کے بعد ۱۹۹۰ء میں رہا ہوئے۔

صدر منڈیلا، جو ۱۹۹۴ء کے انتخابات کے نتیجہ کے طور پر صدارت کے عہدہ پر فائز ہوئے ہیں، سیاسی رہنما اور اعلیٰ پایہ کے مدبر بھی ثابت ہو رہے ہیں۔ اپنی کامیاب جدوجہد کے نتیجہ میں سیاہ فام قوم کو کامیابی اور آزادی سے ہم کنار کر کے بجائے غرور و نخوت کے نشہ میں چور ہونے کے، اپنی دانش مندی، دور اندیشی اور مدبرانہ فیصلوں سے نوزائیدہ خود مختاری، آزادی اور جمہوریت کو حقیقت کی روشنی میں مستحکم بنیادوں پر پائدار بنانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ سیاہ فام جنوبی افریقین قوم کو جمہوریت اور حکومت چلانے کا چونکہ کوئی تجربہ نہیں ہے، اس لئے اگلے ۵ سالوں تک وہ حکومت میں سابقہ صدر کو شریک

اقتدار رکھیں گے۔ چنانچہ ڈی کلارک نے موجودہ حکومت میں نائب صدر کی حیثیت سے عہدہ سنبھال لیا ہے۔ انہیں پارلیمنٹ میں متفقہ طور پر صدارت کے عہدہ کے لئے پارٹی کی طرف سے پیش کیا گیا اور قومی آراء سے منتخب ہو گئے۔ ویسے انتخابات کے نتائج کا یہی مطالبہ بھی تھا۔

یہ بظاہر بڑی عجیب سی بات لگتی ہے کہ منڈیلا نے انہیں لوگوں کو شریک اقتدار بنانے کا فیصلہ کیا جنہوں نے APARTHEID کی باقاعدہ پالیسی وضع کی اور اس پر عمل پیرا ہو کر سیاہ فاموں کو ہر ممکن طریقہ سے تشدد کا نشانہ بنایا۔

## آخر کو اس دیش میں پہنچے

پاکستان کا خواب جس نے بھی دیکھا ہو اور جس نے بھی اپنی ذہانت اور پیشہ وارانہ صلاحیت کے بل بوتے پر لاکھوں معصوموں کو اس کا ان دیکھا اور انجانا گرویدہ بنا کر ان کا خون بہانے اور وطن سے بے وطن بنانے کا کارنامہ انجام دیا، اس پر دل کی بھڑاس نکالنے بیٹھوں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں اور دل کی بات پوری نہ ہو۔ تعجب تو مجھے اپنے اور حبیب کے فیصلہ پر ہوتا ہے۔ مجھے نہ تو نظریاتی لگاؤ پاکستان سے تھا، نہ میں نے کبھی اس تحریک کا ساتھ دیا تھا اور نہ بہت سارے دوسروں بڑے بڑے سرکاری افسران کی مانند ایک نئی ریاست کے کرتا دھرتا کی حیثیت سے کوئی مفاد حاصل کرنا تھا۔ بہرحال سیاسی، ذہنی اور جذباتی خودکشی کا فیصلہ ۱۹۶۵ء کے مئی میں کر لیا گیا اور اگست میں ہم ہندوستان چھوڑ کر ۱۹۶۵ء میں پاکستان آئے تو پے در پے صدمات و حادثات نے زندگی کو ساری خواہشات سے کچھ عرصہ کے لئے بے نیاز سا کر دیا، لیکن زندہ انسان کب تک زندگی سے منہ موڑ سکتا ہے۔ سو ذاتی اور مالی مسائل کے سدھرتے ہی اور جیسے ہی ویزے کی سختیاں نرم پڑیں، ہندوستان کے ویزے کے لئے درخواست دے دی۔

پاکستان ہجرت کرنے کے فوراً بعد ہی سے ایک حسرت بھری تمنا دل میں گھر کیئے رہتی تھی کہ ایک بار تو اس سرزمین کے درشن کر لوں جہاں کے حالات کی بے رحم ستم ظریفی نے ترک وطن پر تو مجبور کر دیا، لیکن جہاں کے دوستوں اور عزیزوں کی محبت اور خلوص کا سرچشمہ ہمیشہ میرے وجود کو سرشار کیئے رہتا ہے اور دل کی تمناؤں کے آگے تو انسان کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑتے ہیں ۔ سو میں نے بھی وہی کیا، مگر کیوں ؟ دل کیوں اس سرزمین سے اتنا وابستہ ہے جہاں سیاسی طور پر میں ایک غیر ملکی ہوں ۔ شاید جس طرح خون کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا، اسی طرح دھرتی کا رشتہ بھی اٹوٹ ہوتا ہے اور ایک وطن میں جنم لینے اور وسیع تر معنوں میں ایک کلچر سے تعلق رکھنے والوں کا جذباتی بندھن بھی مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ امر ہوتا ہے ۔ سو جب بھی ہندوستان جاتے ہیں تو دلی پہنچتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ مٹی، جس پر میں چل رہی ہوں میری اپنی ہے ، لیکن بھلا جب سرزمین پر میرا کوئی حق نہیں ہے تو اس کی مٹی کیسے اپنی ہو سکتی ہے مگر حق ناحق کی باتیں تو سیاسی بانٹ بجڑے کی باتیں ہیں ۔ میں نے اور میرے بہت سارے ہم عصروں نے اس مٹی، اس کی فضاؤں ، اس کے ماحول تہذیب و تمدن سے جنم لیا اور حالات کی پکار پر پاکستان جا بسے ، لیکن دل تو اتھاہ سمندر ہے ۔ نیا رشتہ قائم کرنے سے پرانا بندھن ٹوٹ تو نہیں جاتا نا!

میرے وہ دوست اور عزیز جو مذہب اور نسل کے تعصب سے بالاتر ہندو اور مسلمان دونوں ہی ہیں اور جو میرے لئے غیر ملکی ہوتے ہوئے بھی میرے بہت اپنے ہیں ، ان سے ملنے کی آس نے دل میں خوشی اور مایوسی کے متضاد جذبات کا تلاطم برپا کر رکھا تھا ۔ جس مٹی نے مجھے جنم دیا تھا، مجھے میرا سہاگ بخشا تھا، آج وہاں اس بخشش کو لٹا کر جا رہی تھی ۔ کیسے اس دھرتی پر قدم رکھ سکوں گی ۔ پھر یہ بھی خدشہ تھا کہ جانے دوستوں کا رویہ میرے ساتھ کیسا ہو ۔ وہ مجھے اپنا سمجھیں گے یا غیر ملکی کا

سا اجنبیوں والا برتاؤ کریں گے، لیکن دوستوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جہاں بھی گئی، جس سے بھی ملی، سبھوں نے بچھڑا ہوا عزیز اور کامریڈ سمجھ کر گلے لگایا۔ اس میں ہندو اور مسلمان کی کوئی تفریق نہ تھی۔

پاکستان آنے کے بعد پہلی بار ۳ دسمبر ۱۹۸۱ء میں انڈیا پی۔آئی۔اے۔ سے گئے۔ صرف ڈیڑھ گھنٹے کا سفر مگر طویل مسافت کا احساس۔ ہندوستان چھوڑے ہوئے کم و بیش ۱۵ سال کا عرصہ گذر گیا تھا۔ اپنوں کے پاس پہنچ کر کیا کیفیت ہو گی، خدا کرے میں اپنے جذبات پر حاوی ہو سکوں! اس پندرہ سال کے عرصہ میں زندگی کے بہت سارے نشیب (فراز تو بہت کم آئے تھے) کا مزہ چکھنا پڑا تھا۔ حق رفاقت اگر ادا کیا تو غم دوراں اور غم جاناں دونوں ہی نے۔ کاش! وہ مٹی جسے میں نے ٹھکرا دیا تھا، آج بھی دامن پھیلائے اپنی خوشبوؤں میں مجھے سمیٹ لے! دسمبر کی شامیں پاکستان میں خاصی خوش گوار ہوتی ہیں، لیکن پالم ایرپورٹ پر کڑکڑاتی سردی کا احساس ہوا۔ پھر سرد لہر کو تو یوں بھی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑنا تھا کہ جانے اس سرزمین پر، جو کبھی میری اپنی تھی اور جس پر کبھی بہت دعوے تھے، اب ایک غدار وطن غیر ملکی سے کیسا استقبال ہوتا ہے۔

کسٹم وغیرہ میں کوئی مشکل نہ ہوئی اور سامان لے کر جیسے ہی باہر آئی، اپنے پیارے بھیا کے روشن چہرہ پر نظر پڑی۔ میں نے انہیں ٹیلی گرام تو دے دیا تھا، لیکن ڈر تھا کہ اگر وقت پر نہ ملا تو پھر دلی میں اتنے عرصہ کے بعد دوستوں کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا اور جانے دوست اب دوست رہ گئے تھے یا نہیں۔

ایر پورٹ سے نکل کر ہم لوگوں نے اسٹیشن کی راہ لی کہ اشرف بھیا اور میمونہ بھابھی علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ علی گڑھ کی اہمیت یونی ورسٹی کی وجہ سے ہے اشرف بھیا جس محلہ میں رہتے ہیں، وہ یونیورسٹی سے ملحق ہے اور اسی لئے نسبتاً صاف

ستھرا بھی ہے۔ کراچی کی مانند جگمگاتا شہر تو نہیں ہے، لیکن میرے دل کے اندر اس نے روشنی کی جوت ضرور پیدا کر دی۔

ایک ہفتہ علی گڑھ ٹھہر کر پٹنہ کا پروگرام بنایا۔ "سون بھدرا" ٹرین رات کو وہاں سے چلتی ہے تقریباً نو بجے شب اور دوسرے روز تقریباً دس بجے پٹنہ جنکشن پر موجود ہوتی ہے۔ جب میں انڈیا میں تھی تو تیز رفتار ٹرینیں بھی کم از کم بیس گھنٹوں میں دلی سے پٹنہ پہنچتی تھیں۔ اب تو خیر وقت ہی تیز رفتار ہو گیا ہے۔ وقت کے دوش پر سوار نظام حرکت کو تیز ہونا ہی ہے۔

انڈیا کی ایر کنڈیشنڈ سلیپر کے لئے "کم خرچ بالانشین" والی مثال بالکل صحیح ہے۔ اسی ڈبے میں ایک صاحب شرماجی بھی سفر کر رہے تھے۔ بھیا کے ملاقاتی تھے۔ انہوں نے تعارف کرا دیا۔ بائیں بازو کی ذہنیت والے شرما جی کی ہم راہی میں سفر دل چسپ گذرا۔ رات گئے تک اور پھر دوسری صبح ان سے روس، امریکا، انڈیا اور پاکستان کے حوالہ سے سارے ممکنہ موضوعات پر باتیں اور تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ انہوں نے پاکستان کے حوالہ سے خصوصی طور پر بہت سے سوالات کئے اور میں نے ہندوستان کے بارے میں۔ انہیں دنوں دلی میں پارلیمنٹ کے سامنے خواتین کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ فیمنزم اور ناری جاگیرتی کے اس دور میں یہ مظاہرہ ستی کو از سر نو قانونی حیثیت دینے کے لئے تھا۔

اور پھر پٹنہ پہنچ گئے۔ پٹنہ .... ہائے! کیا چاشنی ہے اس چھوٹے سے لفظ اور شہر میں۔ ہزار کوشش کی اسے بھولنے کی، مگر بھول نہ پائی۔ پٹنہ کی تنگ گندی گلیوں کا مقابلہ بڑے بڑے شہروں سے کیا، مگر میری نظروں میں بازی پٹنہ ہی کے ہاتھوں میں رہی۔ پٹنہ میں بہت کچھ یقیناً بدل گیا تھا اس طویل عرصہ میں۔ نہ بدلتا تو ایک ترقی پذیر زندہ معاشرہ اور ملک کے لئے بڑے شرم کی بات ہوتی، لیکن مجھے ایسا لگا کہ

میرے کامریڈ دوست ، جن کے ساتھ میں نے اصولوں اور تیاگ کی زندگی کی راہ اپنائی تھی ، وہ میرے لئے (کامریڈ زہرا کے لئے) ذرا بھی نہیں بدلے تھے ۔ ڈاکٹر سین جگناتھ ، نیلما ، شبانی ، شنیل ......... کس کس کا نام گنواؤں ؟ لگتا تھا میں اپنے بھائی بہنوں کے درمیان پہنچ گئی ہوں ۔ جس نے سنا دوڑا چلا آرہا ہے کامریڈ زہرا سے (زہرا داؤدی سے نہیں) ملنے ۔ ان کے دلوں میں پاکستان کے لئے نفرت اور بغض کا جذبہ نہ تھا ۔ میں بڑی فراخ دلی سے دونوں ملکوں کی سیاست اور اپنے سرخ نظریوں کے پس منظر میں حالات کے تجزیہ اور مناسب حل پر باتیں کرتی ۔ ایک ماہ تو پلک جھپکتے میں گذر گیا ۔ واپس آنا ہی تھا سو آگئی کہ بسلامتی ہوش وحواس پاکستان کو اپنا ملک بنایا تھا ۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اب وہ پاکستان سے تو کوئی آس لگاتے نہیں ہیں ، لیکن ترقی پسندوں اور سیکولر ذہنیت رکھنے والوں کے علاوہ ایسے افراد کی بھی کمی نہیں ہے جنہیں یہ گلہ ہے کہ سرکاری نوکریوں میں انہیں آبادی کے تناسب سے نوکری اور ترقی نہیں ملتی یا اردو زبان کو اس کا مناسب مقام حاصل نہیں ہے ۔ علاوہ بریں مسلمانوں کے حوالہ سے یہ لوگ حکومت کے اکثر اقدامات کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس بات سے خائف ہیں کہ سیکولرزم کے نام پر حکومت ان کے مذہب میں دخل اندازی نہ کرے ۔ اس کی ایک تازہ ترین مثال شاہ بانو کیس میں عدالتی فیصلہ سے ملتی ہے ، حالانکہ یہ فیصلہ قرآن شریف کے احکام کی روشنی میں ہوا تھا ، لیکن ہندوستان کے اکثر مسلمانوں نے اس فیصلہ کو اپنے مروجہ عائلی قوانین پر حملہ محسوس کیا اس حد تک کہ مسلمانان ہند کی طرف سے اس پر احتجاج ہوا کہ حکومت ہند کو ایک نیا قانون مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے بنانا پڑا ۔

انڈیا کے عوام کی سماجی، معاشرتی اور معاشی صورت حال میں بھی بہت سی متضاد سمتیں ملتی ہیں۔ ایک جانب تو انڈیا دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور سیکولر حکومت ہے جو دنیا کے صنعتی ممالک کی صف میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، دوسری جانب بھوک غربی، بے روزگاری اور جہالت کے رونگھٹے کھڑے کر دینے والے حقائق سامنے آئے۔ دسمبر، جنوری کے کڑاکے کی سردیوں میں دلی میں ایسی کثیر آبادی دیکھنے میں آئی جس کے تن پر پھٹی ہوئی بنیائیں اور دھوتی کی جگہ چیتھڑوں کے علاوہ کچھ نہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھک منگے نہیں بلکہ محنت کش افراد ہیں۔ فٹ پاتھ پر نسلاً در نسلاً زندگی بسر کر دینے والوں کی آبادی کا شمار مشکل ہے۔ میں نے ایک دوست سے سوال کیا کہ ہندوستان سائنس اور صنعتی پیداوار میں اتنی ترقی کر گیا ہے پھر عوام اتنے غریب کیوں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ معاشی نظام کا ڈھانچا جب تک نہیں بدلتا، امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جائے گا۔ پہلے عوام کا خون چوسنے والے صرف ٹاٹا برلا تھے۔ اب لاتعداد ہو گئے ہیں۔ مجھ سے اظہار اختلاف نہ ہو سکا کہ یہ نظریاتی مباحثہ ہو جاتا۔

## مٹی کی پکار

ایک سال سے کچھ ہی زیادہ ہوا تھا کہ انڈیا اور انڈیا والوں کی یاد نے پھر چٹکیاں لینی شروع کر دیں۔ اس بار دماغ میں ہلچل کچھ کم تھی، چنانچہ ۱۵ مارچ ۱۹۹۲ء کو صبح دس بجے پی۔ آئی۔ اے۔ سے دہلی پہنچے۔ بڑے بھائی علی اشرف، جو ہمیشہ علی گڑھ سے دہلی ہمیں خوش آمدید کہنے آجاتے تھے، اپنی علالت کے باعث نہ آسکے۔ اصل میں ہم نے ہی انہیں فون کر کے آنے سے روک دیا تھا۔ بھلا دہلی سے علی گڑھ جانا مشکل ہی کیا ہے جو اس کے لئے بڑے بھائی کو تکلیف دی جائے، چنانچہ ہوائی اڈے

سے ٹیکسی لی اور سیدھے نئی دہلی کے اسٹیشن پہنچے۔

ٹکٹ خریدا۔ ٹرین آنے میں دو گھنٹے کی دیر تھی۔ ویٹنگ روم میں انتظار کرتے، اخبار اور رسائل خریدتے اور ان کی سرسری ورق گردانی کرتے یہ دو گھنٹے دو صدیوں سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط محسوس ہوئے۔ بہرحال وقت تیز رفتار ہو یا سست رو، گذر تو جاتا ہی ہے، چنانچہ ٹرین آئی اور حسب معمول مسافروں سے کھچا کھچ بھری۔ ہمیں بیٹھنے اور سیٹ کے سامنے ہی سامان رکھنے کی جگہ کچھ دوسرے مسافروں کی خوش اخلاقی کے طفیل مل گئی، حالانکہ ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہندوستان کی آبادی بھی تو فرسٹ کلاس کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔

پیدا ہوتے ہی پہلی آواز تو کانوں میں اذان کی ڈالی گئی ہو گی کہ مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا، دوسری آوازیں، جو شعور کے ہر ارتقائی دور میں کانوں میں رس گھولتی رہیں اور ذہن میں گھر بناتی رہیں، وہ یہ تھیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور ہندوستان ہمارا مادر وطن ہے اور بھلا جہاں ماں کا نام یا حوالہ آجائے، وہاں عقیدت کا جذبہ آپ ہی آپ دل میں موجزن نہ ہو، ایسا بھی کہیں ہوا ہے! سو خاصی عمر آنے تک یہ بات بعید از قیاس لگتی تھی کہ انسان اپنے وطن سے بھی بے وفائی کر سکتا ہے، تبھی تو "ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا" میں اقبال کی ہدایت کے باوجود ترمیم نہ کر سکے، لیکن یہ قصہ تب کا ہے جب عمر، سوچ اور تجربہ میں پختگی نہ آئی تھی، کیونکہ ہونے کو تو اس دنیا میں سبھی کچھ ہو سکتا ہے، ہوتا ہے اور ہوا۔ انسان بہت ذہین اور مفاد پرست ہے۔ وہ ماں کے ساتھ بھی فریب کرتا ہے، مادر وطن اپنے عقیدہ اور نظریات کے ساتھ بھی۔ مذہبی عقائد کے اشتراک کی بنا پر قومیت اور وطنیت کی للکار نے ہمیں کبھی متاثر نہیں کیا تھا اور نہ ہم دو قومی نظریہ کو صحت مند تسلیم کرتے تھے ویسے اس ہٹ دھرمی کا کیا علاج کہ بنگلا دیش دو قومی نظریہ ہی کے مزار پر تعمیر ہو گیا، لیکن رٹ وہی ہے عالم اسلام کی بات کیا کریں۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستان بنایا ہی اسی

لے گیا تھا کہ مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل کر شہید یا غازی ہونے کا رتبہ حاصل کر سکیں ۔ پاکستان میں ایک دوسرے کو قتل کر کے امریکا سے گلہ کریں کہ مسلمان عورتوں کی حرمت بچانے کی اسے فکر نہیں ہے کہ عیسائی ، یہودی ہندو اسلام کے ازلی دشمن ہیں ، لڑکیوں کو غائب کر کے ناموس رسول کا تحفظ اور اپنی مردانگی کا سکہ جمائیں ، مگر بات تو ہو رہی تھی اس سرزمین کی پکار کی جس کے بارے میں ہم کبھی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ " ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستان ہمارا " ۔ اب ہندوستان ہمارا وطن ہو نہ ہو ، ہم اس کے شہری ہوں نہ ہوں لیکن ہمارا جنم بھومی ضرور ہے ۔

آج کل ترقی یافتہ معاشروں میں " بائلوجیکل فادر " کی اصطلاح بہت مقبول ہو رہی ہے ۔ سماجی اور معاشرتی انقلاب کے نتیجہ میں یہ بائلوجیکل کی اصطلاح بہت ضروری تھی ۔ اسی طرح " بائلوجیکل مادر وطن " کی بھی اصطلاح ضروری ہے اور جیسے ناخلف اولاد اور ناخلف باپ کا آپس کا خون کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا ، اسی طرح خواہ وہ وطن کا غدار ہو یا وفادار ، انسان کا مٹی سے رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا کہ وہ مٹی کا پتلا ہے ، مٹی سے روزی حاصل کرتا ہے اور مٹی ہی میں مل جاتا ہے ۔ مٹی کے پتلے پر یاد آیا کہ بچپن میں ہم لوگ اپنے پیروں کو ناخن سے کھرچ کر ایک دوسرے کو دکھاتے تھے کہ دیکھو مٹی نکل آئی ......... کہاں سے کہاں بات چل نکلی ۔ یہاں تک تو بتا چکے کہ ہم بخیر و خوبی ٹرین میں جگہ حاصل کر کے بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے ، چنانچہ نئی دہلی اسٹیشن سے پہلے تو ٹرین نے حسب روایت رینگنا شروع کیا پھر جلد ہی فراٹے بھرنے لگی ۔ علی گڑھ میں گاڑی صرف دو منٹ رکتی ہے ۔ ہم کراچی سے روانہ ہوئے تھے تو خاصے پیچیدہ سے مرض میں مبتلا تھے جس کی تشخیص نے خود ہمیں اور ڈاکٹروں کو خاصا ہراساں کر رکھا تھا ۔ شاید اسی وجہ سے یا ٹرین پر بھیڑ کی وجہ سے ، ٹرین سے اترتے ہوئے سر چکرایا اور ہم بے ہوش ہو کر پلیٹ فارم سے نیچے ریلوے لائن پر آگرے ۔

ٹرین چل پڑی اور زنجیر کھینچ کر روکی گئی۔ لوگوں نے بعد میں بتایا کہ ٹرین کے باڈی کے نیچے ہم گرے تھے، اس لئے کچلے جانے سے بچ گئے۔ کانوں میں ایمبولنس کا نام اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے نے جلد ہی ہوش میں آنے میں مدد کی، لیکن نیم غشی کی حالت میں بار بار یہ جملہ ذہن پر دستک دے رہا تھا کہ کیا واقعی ہمیں ہماری مٹی کھینچ لائی تھی۔ یہ تو بہت دیر بعد یقین آیا کہ ہم اسی دنیا میں ہیں اور ہمارے سارے اعضا صحیح و سلامت ہیں تو ہماری مٹی نے ہمارے ساتھ دغا نہ کی، ہماری غداری کا انتقام نہ لیا کہ اتنا بڑا حادثہ ہونے پر بھی میرے جسم پر خراش ت۔۔ نہ آئی۔ بھوکے ننگے اور میلے کپڑوں میں ملبوس لوگوں کی بھیڑ ہمارے گرد جمع ہونے پر بھی ہمارا پرس اور سامان محفوظ رہا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے کچھ لڑکے بھی اسی ٹرین سے آرہے تھے۔ وہ بڑے ذمہ دار ثابت ہوئے۔ اسپتال پہنچنا چاہتے تھے، لیکن ہم نے گھر کو ترجیح دی۔ معجزانہ طور پر بھلے چنگے گھر پہنچے تو اشرف بھیا اور میمونہ بھابھی کی ڈانٹ جب تک رہے، کھانے کو ملتی رہی۔

بہت دنوں سے آرزو تھی کہ تاج محل پھر جا کر دیکھیں۔ کیا وہ اب بھی اتنا ہی حسین ایک شہنشاہ کی امر محبت کا شاہکار ہے، جتنا حسین اور عظیم وہ تب تھا جب حبیب کے ساتھ ہم نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور پھر بسم اللہ ہوٹل کی چپاتی اور سالن کا ذائقہ کہیں بدل تو نہیں گیا۔

۲۵ مارچ کو رات نو بجے پٹنہ سے دلی پہنچے۔ ارملا ماتھر کے یہاں قیام تھا۔ اسی وقت فون کر کے صبح چھ بجے آگرہ کے لئے ٹیکسی کا انتظام کیا۔ صرف ہم اور ارملا ساتھ تھے۔ ماتھر بھائی کو گھر پر چھوڑ دیا گیا۔ راستہ میں بہت سارے قابل دید تواریخی مقامات گذرے، مگر سب سے دامن بچا کر نکلتے چلے گئے۔ جگہیں تو ساری دیکھی ہوئی تھیں۔ تڑپ تو صرف تاج محل کے دیدار کی تھی کہ ایک بار دیکھا تھا، دوسری بار دیکھنے کی حسرت تھی۔ ایک اور دو میں فاصلہ ہی کتنا ہوتا ہے، لیکن پہلی اور

دوسری بار کے تاج محل کی مسافت بہت طویل تھی۔ پہلی بار جب تاج محل گئے تو پٹنہ کے علاوہ ہندوستان کا بھی کوئی شہر نہ دیکھا تھا اور دوسری بار ساری دنیا کھنگال کر پہنچے تھے۔ پھر بھی تاج محل بہت انوکھا، بہت نیا نیا اور بہت اپنا اپنا سا لگا۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکے ہیں آگرہ اور تاج محل زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا حبیب کے ساتھ نئی نئی شادی ہوئی تھی اور پٹنہ سے دہلی اور آگرہ کا سفر ٹرین کے انٹر کلاس کے ڈبے میں وہ دلکشی رکھتا تھا جو آج ہوائی جہاز کے اسپیشل کلاس میں تو کیا چاند کی سیر میں بھی نہ ہو۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ الہ آباد جنکشن پر گاڑی تین بجے رات کو رکی تو مرکری لائٹ سے جنکشن پر روشنی کا چمتکار ہمیں مسحور سا کر گیا۔ ہم نے کبھی کاہے کو مرکری لائٹ (جسے اب ٹیوب لائٹ کہتے ہیں) دیکھی ہو۔ سمجھا کہ اتنی چمک دار سی صبح ہو گئی ہے۔

سارے دن ہم لوگ تاج محل کی سیر کرنے کے بعد بسم اللہ ہوٹل گئے اور تام چینی کی رکابی میں سالن اور چپاتی کھائی۔ اس سالن اور چپاتی کا ذائقہ آج بھی ذہن کے ساتھ ساتھ حافظہ میں بھی محفوظ ہے۔ بھوک نے ستایا تو ہم نے ارملا سے کہا کہ چلو بسم اللہ ہوٹل میں کھپریل کی چھت کے نیچے تام چینی کی پلیٹ میں چپاتی اور سالن کھاتے ہیں۔ وہ ہنس پڑی۔ بسم اللہ ہوٹل جو، ہمارے خوابوں میں بسا ہوا تھا، وہ تو نہیں ملا ناچار بہترین ٹورسٹ ہوٹل میں تام چینی کی رکابی کی بجائے فینسی ڈنر سیٹ میں شوربے والے گوشت اور چپاتی کی جگہ مینو دیکھ کر کھانے کا انتخاب کرنا پڑا۔

۲۸ مارچ کو صبح سویرے کراچی کی فلائٹ تھی۔ ۲۶ کا سارا دن آگرہ میں تاج محل کی چھاؤں میں بسر ہوا۔ دوسرے روز ارملا نے سرپرائز دیا۔ شہر میں کہیں اور چلنے کا پروگرام بنا کر ہمیں ساتھ لیا اور جب باتوں سے فرصت ملی تو ہمیں پتا چلا کہ بس اب ہم لوگ قطب مینار پہنچنے ہی والے ہیں۔ سو یہاں بھی بات وہی پہلی بار سے شروع ہوتی ہے کہ جب پہلی بار گئے تو قطب مینار کی ساری منزلیں کودتے پھلانگتے

طے کر کے اس کی بلند ترین چوٹی تک پہنچ گئے تھے، حتیٰ کہ حبیب بھی پیچھے چھوٹ گئے
تھے۔ اب آخری یا دوسری بار جو گئے تو زندگی کی مشکل ترین منازل کی چڑھائی نے
قطب مینار کی بلندی کو چھونے کا حوصلہ ہی باقی نہ چھوڑا تھا اور پھر شریک سفر نے،
جن سے ہم آگے نکل گئے تھے، ایسا انتقام لیا کہ حیات کی بہت ساری منزلیں پھلانگ
کر مجھ سے بہت ہی آگے نکل گئے۔

ٹرین کے حادثہ نے تو کچھ گزند نہ پہنچایا۔ لیکن انڈیا جانے کے تقریباً ۳، ۴ ماہ
پہلے ہی سے ہمیں سلائیوا گلینڈ میں کچھ تکلیف تھی جس کی بنا پر متواتر بخار آتا رہتا تھا
اور ہم نے اسی حالت میں اپنی مٹی، اپنی تہذیب، اپنے بھائی اور دوستوں کی خاموش
پکار پر ان کے درشن کو گھر چھوڑ کر سفر کی راہ اپنائی۔ دو، چار دنوں میں بیماری نے
اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ علی گڑھ اسپتال میں سرجن نے فوری آپریشن کی بات کی
تو ہم نے بھی فوراً واپسی کی ٹھان لی کہ ہماری چھٹی حس نے آگاہ کیا کہ یہ کوئی غیر
معمولی سا چکر ہے اور ویسے بھی ہم جیسی ٹیڑھی ذہنیت والوں کو بھلا سیدھی سادی
بیماریاں کیوں منہ لگانے لگیں۔ علی گڑھ میں بھائی بھابھی سے لے کر دوست احباب
سبھوں نے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہم وہیں آپریشن کرا کے دو ہفتوں بعد واپس
جائیں اور اگر فوراً واپس جانا ہی ہے تو سیدھے کراچی جاؤں۔ اپنے سابقہ پروگرام کے
مطابق پٹنہ اور کلکتہ کا چکر نہ رکھیں۔

بڑی مشکلوں سے سبھوں کو ناراض کر کے جدا ہونے کا بوجھ اور اتنے پیاروں
کی خواہش رد کرنے کا صدمہ دل پر لئے ہم پٹنہ پہنچے کہ اگر ہم اپنے کامریڈ، اپنے بھائی،
اپنے دوست جگناتھ اور نیلما ڈاکٹر سین کی بیوی اور اسی طرح کے بہت سے "اپنوں"
سے نہ ملتے تو مر کر بھی چین پاتے۔ پٹنہ میں سرجن نے کینسر کا خدشہ ظاہر کیا اور
یوں وقت ضائع کئے بغیر کراچی واپسی لازمی ہوئی۔ یعنی محض چند روز پٹنہ اور دلی میں
رہے تاکہ تاج محل پر ایک الوداعی نظر تو ڈال سکیں۔ ویسے کیا مزہ آتا ہے ہندوستان

آکر! پھر ہندوستان پٹنہ، مظفرپور، کلکتہ اور علی گڑھ میں آنے کا اپنا مزہ۔ برسوں گذر گئے مگر غیر ملک ہو جانے کے باوجود بھی غیر ملکی ہونے کا جذبہ نہیں پیدا ہو سکا۔ اس سرزمین کو، جس کی خاک سے جنم لیا، جسے کبھی مادر وطن کہتے تھے، جس کی ہواؤں اور فضاؤں سے اصولوں کا احترام اور اصولوں کا تقدس سیکھا، اسے کیسے بھول جائیں بہرحال تاج محل سے واپسی کے تیسرے روز ہم اینٹ اور سیمنٹ سے بنے ہوئے اپنے گھر واپس آئے جو ان دنوں کراچی میں ہے۔

## سر کے بال اور ہم

ظاہری حلیہ کی طرف سے ہمیشہ کے لاپرواہ رہے۔ خیر! اسکول تو اسکول کہ الڑھپن کا دور تھا۔ ایک بار پٹنہ کالج، جب بی۔اے۔ کی طالبہ تھے، دو پیروں میں دو مختلف سینڈل پہن کر چلے گئے۔ ایک پیر میں اپنا، دوسرے میں حبیب کا۔ خبر تب ہوئی جب لڑکوں نے جملے کسنے شروع کئے۔

عورتیں میک اپ کی شوقین ہوتی ہیں۔ مجھے لپ اسٹک اور چہرہ کی لیپاپوتی سے ہمیشہ للہی بغض رہا۔ ہاں! ایک تمنا بچپن سے تھی کہ اپنے بال بھی لانبے ہوتے، لیکن جیسے بہت سی تمنائیں سراب ثابت ہوتی ہیں سو اس تمنا کا بھی وہی حشر ہوتا رہا اور بہت سارے انڈے، سکاکائی اور آملے سر میں گھس گھس کر یونہی بے کار گئے، مگر بیرون ملک جو گئے تو جانے کیوں اور کیسے بالوں نے ساری عمر کی تگ و دو کی کسر نکال ڈالی۔ چند ہی ماہ کی مدت میں یہ خوب گھنے لانبے اور چمکیلے ہو گئے۔ جب ہم واپس کراچی پہنچے تو ہمارا بڑا سا جوڑا دیکھ کر کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہمارے اصلی بال ہیں۔ لوگوں نے سمجھا کہ ہم نے بال کٹوانے کی بجائے فیشن میں بڑا سا وگ لگا رکھا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ اکثر دوستوں نے جوڑا کھلوا کر دیکھا اور تب یقین کرنے

پر تیار ہوئے کہ ہاں! "فصل بہاراں" ہے۔ اب سب لوگ میرے پیچھے پڑے کہ بالوں کے اس عروج کا اصلی راز کیا ہے۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے یہ وضاحت کر کے جان چھڑائی کہ بچپن میں اماں ابا کے تربیتی جوتوں کے نذر بال ہوتے تھے۔

نوجوانی اور جوانی میں خود اپنے بال بچوں کی تربیت کے دباؤ نے بالوں کا نذرانہ لیا۔ حبیب کے ختم ہونے کے بعد سے اب تک سارے مسائل، ساری پریشانیوں کا بوجھ صرف اپنی ذات پر تھا اور ان کا نزلہ رجوع ہوتا تھا سر کے بالوں پر۔ سو بالوں کو پنپنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اب چار مائل بہ عروج بیٹے ہیں جنہوں نے میری ساری پریشانیاں بانٹ لی ہیں، چنانچہ صحیح معنوں میں تو بالوں کی کھیتی کی شادابی کا وقت ہی اب آیا ہے۔ خیر! بالوں کی بات تو ضمناً چل پڑی۔ رہی ظاہری لباس میں سادگی اور بناؤ سنگھار سے بے نیازی کی بات تو جیسے ہر فرد، ماں باپ اور گھر کے ماحول اور تربیت کا مرقع ہوتا ہے، وہی کچھ کم از کم اس معنیٰ میں صد فی صد ہمارے ساتھ ہوا۔ میرے ابا مولانا علی اصغر صاحب کانگریسی قوم پرست اور عورتوں کی آزادی اور مساوات کے بڑے علم بردار تھے۔ یہ بات ہم نے ان سے بارہا سنی تھی کہ عورتوں کو ان کے انسانی منصب سے گرا کر اپنا محکوم بنانے کے لئے مردوں نے انہیں سونے چاندی کی ہتھکڑی اور بیڑی پہنا دی۔ غلامی کا طوق ان کے گلے میں سونے کی زنجیر کی شکل میں اور قابو کرنے کے لئے خوب صورت نکیل نتھ کی شکل میں، چنانچہ ہم نے اماں کو بھی کوئی زیور پہنے نہ دیکھا نہ ہمیں زیوروں سے کبھی کوئی رغبت پیدا ہوئی۔

## ٹی وی اور ہم

ابھی تو اس بات کا تذکرہ کرنا بھی مضحکہ خیز سا لگتا ہے کہ ہم نے زندگی میں پہلی بار ٹی۔ وی۔ کی کارکردگی کب دیکھی۔ ہم کلکتہ میں تھے۔ تبھی وہاں کل ہند

نمائش لگی اور بہت چرچا ہوا کہ چلتے پھرتے اپنے آپ کو ٹی۔وی۔پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم اور حبیب جوش اشتیاق میں بچوں کو لے کر نمائش میں پہنچے۔ ایک بڑا سا بلیک اینڈ وہائٹ ٹی۔وی۔لگا ہوا تھا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم اور بچے بھی اپنے آپ کو ٹی۔وی۔میں چلتا پھرتا دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور ان دنوں کے خواب دیکھ رہے تھے جب ٹی۔وی۔ہمارے گھر میں بھی آجائے گا۔

پھر ۱۹۶۵ء میں کراچی آگئے۔ کراچی میں ٹی۔وی۔کی نشریات تو شروع نہیں ہوئی تھیں، لیکن ٹی۔وی۔اسٹیشن کے مستقبل قریب میں کھل جانے کا چرچا اس حد تک تھا کہ چھوٹے بڑے سرکاری افسران، جو حکومت کے پیسے سے امریکا یورپ سیر کرنے کے لئے (ٹریننگ حاصل کرنے کے بہانہ) جاتے تھے، وہ باہر سے ٹی۔وی۔ بھی اکثر لے آتے۔

پھر ۱۹۶۷ء میں ٹی۔وی۔اسٹیشن نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۷۰ء میں ہم نے بھی بالآخر روسی ٹی۔وی۔چھ سو میں خرید ہی لیا۔ اس وقت تک یہ عالم تھا کہ محلہ میں جن جن لوگوں کے گھر میں اب تک ٹی۔وی۔نہ خریدا گیا تھا بچے بڑے ٹی وی۔دیکھنے جمع ہو جاتے تھے۔ یہ اجتماع بالکل گاؤں کے چوپال کا منظر پیش کرتا تھا سوا اس کے کہ چوپال میں حاضرین مجلس قصہ کہانی اور خبریں ایک دوسرے کو سناتے ہیں اور یہاں روشنی بند کر کے (ان دنوں ایسا ہی ہوتا تھا) لوگ خاموشی سے ریڈیو سے قصہ کہانی، خبریں اور تبصرے سنتے اور واہ وا اور عش عش کرتے تھے۔

اس وقت ہم میں سے کسی کو یہ احساس اور اندازہ نہ تھا کہ ۲ عشروں کے اندر ہی ٹی۔وی۔کلچر ہمارے معاشرے پر حاوی ہو کر سماج کی ساری اخلاقی اور نظریاتی قدروں کو دیمک کی طرح چاٹ کر تباہ کر دینے والا ہے۔

# بیان اپنی سادہ لوحی کا

کبھی کبھی قصہ پارینہ یا بھولی بسری حماقتوں کو یاد کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے، خاص طور پر جب رات کو نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہو اور سفرنامہ یا ڈائری میں لکھنے کو کوئی ڈھنگ کی بات سوجھ نہ رہی ہو۔ سو اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ہم دیر سے آنکھیں بند کئے "آجاری نیندیا!" کا ورد کئے جا رہے تھے کہ یاد آیا جب ہم پہلی بار امریکا گئے تھے تو کتنے دیہاتی سے تھے بھلا کیسے؟ چلو! اب کانٹوں بھری رہ گذر حیات کی داستان لکھنے ہی بیٹھے ہیں تو ہنسنے ہنسانے کے واقعات و حادثات کی کاٹ چھانٹ کیا۔ لکھ ہی دیتے ہیں۔ ساری کہانی میں کانٹوں پر چلنے والے بھی بڑی دل چسپ حماقتیں کرتے ہیں۔

ہوا یوں کہ کناڈا آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ نیویارک کا پروگرام بن گیا۔ اپنی حماقت پر تھوڑا سا پردہ ڈالنے کی خاطر یہ بتاتے چلیں کہ کناڈا ہماری یہ میری پہلی آمد تھی۔ امریکا کے لئے ویزے کی ضرورت تھی۔ ہمارے بیٹے ناہید نے آفس جاتے جاتے پٹ سے کہا،

"امی! آپ امریکن امیگریشن کو فون کر کے ویزے کے سلسلہ میں معلومات حاصل کر لیں۔ کر سکتی ہیں نا؟"

"ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ کیا تمہیں شک ہے کہ مجھے فون کرنا نہیں آتا یا انگریزی سمجھ میں نہیں آتی"۔ ہمیں غصہ آگیا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ یہ امریکن لتنے غیر اہل زبان ہیں کہ نو آبادیاتی دور کے انگریزی پڑھے لکھے ہم جیسے لوگوں کی سمجھ میں ان کی انگریزی ذرا مشکل ہی سے آتی ہے۔ پھر بھی ......... خیر فون تو کر ہی لیں گے۔

ناہید امریکن امیگریشن والوں کا فون نمبر دے کر اپنے آفس چلا گیا۔ ہم نے فون اٹھایا۔ ہلو ہلو کہتے ہی رہے اور دوسری طرف سے ایک طویل ہدایت نامہ نشر ہونا شروع ہو گیا۔ مارے گھبراہٹ کے ریسیور ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ یا اللہ! ابھی تو ہم اپنا مدعا بیان بھی نہ کر پائے تھے۔ یہ ٹیلی فون کے آلہ کو ہمارے مقصد کا علم کیسے ہوا! ضرور ٹیلی فون کے اندر کوئی بھوت تھا۔ لیکن یہ بھوت والی بات کچھ جچی نہیں۔ شاید امریکا والوں نے کوئی نیا آلہ ایجاد کر لیا ہے جو انسانوں کے دل کی باتیں جان کر جواب دیتا ہے۔ سو تھوڑی دیر بعد جب ہوش و حواس بجا ہوئے تو پھر ریسیور اٹھا کر ڈائل کیا۔ ٹیلی فون۔ اس بار ہم نے ہیلو کہنے میں کچھ توقف کیا، لیکن پھر وہی الم نشرہ۔ یا اللہ' ماجرا کیا ہے، لیکن اب دل کا خوف اور گھبراہٹ قدرے کم ہو گئی تھی، اس لئے تیسری بار تفریحاً اور کچھ اشتیاق جستجو میں پھر وہی نمبر ڈائل کیا اب کی چونکہ دل کی دھڑکنیں مکمل طور پر قابو میں آگئی تھیں، اس لئے پہلا ہی جملہ بھوت کا سمجھ میں آیا جو کچھ یوں تھا:

" یہ ریکارڈنگ ہے۔ آج سنیچر ہے، اس لئے آفس بند ہے۔ ویزے کی معلومات سوموار کو حاصل کریں۔ " توبہ ہے اللہ! اب ایسا بھی نہیں کہ ہمیں ٹیلی فون کرنا نہیں آتا۔ یہاں تو عادت یہ ہے کہ آپ اہم سے اہم مقصد کے لئے متعلقہ آفس میں فون کریں تب بھی یا تو کوئی فون اٹھائے گا نہیں یا الٹا سیدھا جواب ملے گا۔ سو ہم کیا، کسی بھی شریف پاکستانی کو ٹیلی فون پر حسب مدعا فوری ہدایت مل جائے تو وہ اسے جادو کی کرامات ہی سمجھے گا۔ شام کو ناہید آیا تو ہم نے بڑے فخر سے اسے بتایا کہ ہم نے ویزے کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔

بچپن کے تصورات اور تجربات بڑے دل کش ہوتے ہیں۔ حد ہے کہ ماں باپ کے ہاتھوں کی مار اور سرزنش بھی ان کے مرحوم ہونے کے بعد " محرومیت " کا

احساس دلاتی ہے، خواہ عمر میں بڑھاپے کی سرحد کو بھی پار کرنے کی نوبت نہ آگئی ہو

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم مٹی کے گھروندوں اور گڑیوں سے کھلا کرتے تھے ۔ تب بہت سارے کھلونے جاپان سے بن کر آتے تھے اگرچہ چینی کے لچکڑے ہوتے تھے ۔ ہمیں کسی عزیز نے ایک لچکڑے کی گڑیا کلکتہ سے لا کر دی ۔ ان دنوں کلکتہ کا نام آج کے لندن سے زیادہ رعب دار تھا ۔ اب تک ہم کپڑے کی بنی ہوئی گڑیوں سے کھیلتے رہے تھے ۔ یہ پتا بھی نہ تھا کہ لچکڑے کی گڑیا اتنی پیاری ہوتی ہے ۔ یہ لچکڑے کی گڑیا گو محض ایک کھلونا تھی، لیکن اس کی یاد ہماری میراث بن کر رہ گئی تھی ۔ اس گڑیا کو ہم نے ایسی محفوظ جگہ رکھ دیا تھا جہاں یہ دوسرے بچوں کی نظروں اور ہاتھوں سے محفوظ رہ سکے، لیکن قسام ازل نے تو فیصلہ کر رکھا تھا کہ میرے حصہ میں نہ لچکڑے کی گڑیا آئے گی نہ جیتی جاگتی انسانی گڑیا ۔ سو صبح اٹھ کر گڑیا کو اس درگت میں پایا کہ چوہوں نے اسے بری طرح کتر ڈالا تھا ۔ ہم خوب روئے، خوب ہی روئے ۔ لگتا تھا کسی دائمی محرومی کے کرب سے آشنا کرنے کے لئے ہی یہ گڑیا ہمارے ہاتھوں میں آئی تھی ۔ لچکڑے کی دوسری گڑیا ہمیں دوبارہ ملی بھی کہ نہیں، یاد نہیں ۔

اس حادثہ کے گویا قرنوں بعد جمیل مظہری کا افسانہ "فرض کی قرباں گاہ پر لچکڑے کی گڑیا" پڑھا تو بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آگئیں ۔ اب تو لچکڑے کا نام بھی سننے میں نہیں آتا ۔ جب ہم پہلی بار ملک سے باہر ہالینڈ گئے تو وہاں ایک بڑی سی پلاسٹک کی گڑیا خریدی ۔ اس گڑیا کے پیٹ کے اندر چھوٹا سا ریکارڈ تھا ۔ بیٹری سے چلتا تھا اور آن کرنے سے گویا نرسری گانے گاتی تھی ۔ ہمیں دیکھ کر بہت اچھا لگا اور ہم نے اسے خرید لیا ۔ اب تو اس کمپیوٹر کے دور میں ایک سے ایک گڑیاں ایجاد ہو گئی

ہیں اور ہم تقریباً ہر سال باہر کے ممالک جاتے ہیں اور کچھ خریدیں نہ خریدیں ، کئی کئی گڑیاں ضرور خریدتے ہیں ۔ وطن واپس آکر کچھ دنوں تو یہ گڑیاں ہمارے گھر کی زینت بنی رہتی ہیں پھر عزیز و اقارب اور دوستوں کی بچیوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں ۔

گڑیوں کے سلسلہ میں جاپان کا تذکرہ آیا تو یاد آیا کہ ہمارے بچپن اور نوعمری میں جاپانی صنعت کی پیداوار کو گھٹیا مال سمجھا جاتا تھا ۔ کسی چیز کو غیر معیاری کہنا ہو تو کہتے تھے جاپانی مال ہے ، مگر آسمان بھی کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے ۔ اج حالت یہ ہے کہ کسی چیز کو معیاری ثابت کرنا ہو تو کہتے ہیں " ارے بھئی ! جاپان کا بنا ہوا ہے " اور تو اور اب تو جاپان دنیا کی واحد سپر پاور کا اقتصادی اور معاشی ، صنعتی اور سائنسی میدان میں حریف بن بیٹھا ہے ۔

بات سے بات نکلتی ہے ۔ گڑیوں کے گھروندوں پر یاد آیا کہ ہر دیوالی میں ہمارے گھروں میں لڑکیاں گھروندے مٹی کے بناتی تھیں ۔ مٹی کے کھلونے جیسے گڑیاں ، چولہا ، چکی ، گھڑے اور صراحیاں بہت خوب صورت چھوٹے چھوٹے رنگے ہوئے ملتے تھے ۔ گھروندوں میں مٹی کی دیوار بنا کر ہم اس کے اندر کمرے ، باورچی خانہ وغیرہ بناتے اور انہیں مٹی کے کھلونوں سے سجاتے اور مٹی کا دیا جلا کر روشن کرتے ۔ اماں اور ابا اہل حدیث فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اسی لئے ہم نے کبھی گھر میں نذر و نیاز ہوتے نہیں دیکھی ۔ حد یہ ہے کہ اماں بتاتی تھیں کہ انہوں نے بچپن میں کبھی گڑیا بھی نہیں کھیلی کہ نانا ابا کی سخت ممانعت تھی ۔ جاندار کی شکل کا کھلونا بنانا یا کھیلنا ، بدعت سمجھا جاتا تھا ، لیکن ہمارے گڑیا کھیلنے یا گھروندہ بنانے پر اماں ابا کبھی معترض نہ ہوئے ، شاید اس لئے کہ اماں ابا کا تعلق اہل حدیث فرقہ سے زیادہ انسانی فرقہ سے تھا اور وہ لوگ ہر قسم کے تعصب سے پاک تھے ۔

پتا نہیں مادی وجود کے قالب میں آنے سے پہلے ہی عالم بالا میں ہم سے کیا گناہ سرزد ہو گیا تھا کہ اس دنیا میں اللہ میاں نے ہمیں محبت کے دو اہم رشتوں اور لذتوں سے محروم رکھا، یعنی مجھے نہ کوئی بہن عطا کی نہ بیٹی۔ حضرت آدم اور بی بی ہوا کو کم از کم یہ تو علم تھا کہ کون سا گناہ ان سے سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں وہ جنت سے نکالے گئے۔ بہرحال ہمیں انجانے گناہ کی بنا پر بہن اور بیٹی سے محرومی کی سزا ملی تھی، اس لئے مشیت ایزدی نے اس کی بھرپور تلافی یوں کی کہ چار بڑے اچھے سعادت مند بیٹے، یعنی تنویر، جاوید، ناہید اور ندیم (داؤدی سبھوں کے نام کے آگے) عطا کیے۔ ان چاروں کی رفیق حیات، یعنی ہماری چاروں بہوئیں، بھی بڑی اچھی اور محبت کرنے والی ہیں (اور ہم نے انہیں بیٹیاں بنا رکھا ہے)۔ ان کے نام لکھنا بھی ضروری ہیں کہ نہ لکھوں تو انہیں شکوہ ہو گا کہ ہم نے اپنی سوانح میں بیٹوں کا تو نام بنام تعارف کرایا اور انہیں نظرانداز کر دیا۔ سو ان کے نام ہیں: عفت، شیریں، قمر اور عرشیہ (داؤدیز)۔

اور گو کہ اوراق کتاب پر آخر میں، لیکن کتاب دل کے ورق اول پر سب سے پہلے جو نام کندہ ہے، اسے کیسے بھول سکتے ہیں۔ وہ ہے "ارم داؤدی" ہماری اکلوتی پوتی۔ حبیب داؤدی خاندان کی واحد بائلوجیکل آنسہ رکن۔ جی ہاں! ارم کو بھی اس پر بہت گھمنڈ ہے۔ کہتی ہے،

آپ تو داؤدی خاندان میں باہر سے آکر شامل ہوئی ہیں۔ یہ ارم بڑی نٹ کھٹ، ذہین، بڑی پیاری ہے۔ پڑھنے میں بہت تیز، باتیں کرنے میں بہت طرار۔ دل موہ لینے میں بڑی استاد اور ہماری نظروں کا چاند ہے۔ وہ نیا والا چاند جس میں داغ نہیں ہوتا اور جو اصلی چاند کی مانند بدصورت اور بھدا بھی نہیں۔ یہ ہمیں سال میں دو خط ضرور لکھتی ہے انگلش میں اور کمپیوٹر سے خط خاصا طویل ہوتا ہے اور مجھے پڑھنے

میں اور بعد میں خط کی ہدایتوں پر عمل کرنے میں کافی وقت اور خاصی محنت صرف کرنی پڑتی ہے کہ دو فل اسکیپ سائز پر مشتمل خط ہیں ۔ "السلام علیکم" اور آخر میں نام کے علاوہ طرح طرح کے جدید ڈیزائنوں کے لباس تیار کرا کر کاسٹیوم جیولری (جو میچنگ بھی ہوں) کے ساتھ بھیجنے کی فرمائش ہوتی ہے ۔

اب ذرا پوتوں کی باتیں بھی ہو جائیں کہ ارم ہزار پیاری سہی ، قبر پر چراغ تو بیٹے پوتے ہی جلائیں گے (یہ جملہ صرف ارم کو جلانے کے لئے لکھا ہے) ۔ ویسے بھی ہزار فیمنزم کا دور سہی ، اس تشدد اور جرائم کی دنیا میں محافظ تو مرد ہی ہے نا! سو پوتوں کے نام یہ ہیں : شارق (تنویر) ، نبیل (جاوید) ، احمر اور عادل (ناہید) ۔ حبیب زین اور دانش (ندیم)

مختصراً ساری زندگی کی مادی کمائی ہمارے چاروں بیٹے ، ان کی رفیقۂ حیات اور ان کے بچے ہیں ۔ ہماری نظریاتی کمائی مارکسسٹ فلسفہ ، سیکولرزم ، انسانیت پر اعتماد اور اعتقاد ۔

---

# ہماری مطبوعات

| | | | |
|---|---|---|---|
| گرداب کی شناوری | (خود نوشت) | زہرا داؤدی | مجلد/ ۱۵۰ |
| موج موج تشنگی | (شعری مجموعہ) | اصغر مہدی نظمی | مجلد ۔/۱۰۰ |
| امکان | (شعری مجموعہ) | مسلم شمیم | مجلد ۔/۱۵۰ |
| سرزمینِ انقلاب | (سفر نامہ) | سید علی اکبر رضوی | مجلد ۔/۲۰۰ |
| کوہ قاف کے اِس پار | (سفر نامہ) | سید علی اکبر رضوی | مجلد ۔/۱۰۰ |
| بیادِ غالب | (طرحی غزلیں) | اطہر رضوی | مجلد ۔/۳۰۰ |
| لفظوں کے گلاب | (منظوم اقوال) | اطہر راز | مجلد ۔/۱۰۰ |
| مشرقِ وسطیٰ میں اردو | (انتخاب) | قمر حیدر قمر | مجلد ۔/۲۲۰ |
| مکالمات جوش و راغب | | (مرتبہ راغب مراد آبادی) | مجلد ۔/۱۰۰ |
| تاریخ کی گواہی | (تحقیق) | آغا انور گل | مجلد ۔/۲۰۰ |

# زیرِ طباعت

| | | |
|---|---|---|
| حرفِ جنوں | (اردو و فارسی کلام) | حسین انجم |
| ارضِ جلال و جمال | (سفر نامہ) | سید علی اکبر رضوی |
| احتشام حسین۔ فکر و فن | | ڈاکٹر شکیل نوازش رضا |
| مراثیِ میر خلیق | | ڈاکٹر اکبر حیدری |
| ظہیر دہلوی کے مرثیے | | اقبال کاظمی |
| اردو کا سوانحی ادب | | مظہر جمیل |
| جدید سندھی ادب | | مظہر جمیل |
| ہمعصر اردو افسانے | | مظہر جمیل |
| مولانا باقر شمس۔ شخصیت و فن | | حسین انجم |
| دنیا کے عظیم شعرا | | اطہر راز |
| دیپ سے دیپ جلے | | ترغیب بلند نقوی |